اپریل سنہ 58

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۴۳۰

رجب المرجب ۱۳۷۷ھ

جلد ۵۰ عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

چندہ سالانہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۰	بابت ماہ رجب ۱۳۷۷ھ مطابق اپریل ۱۹۵۸ء	عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یوں تو اسلام ہمیشہ ملحدین و منافقین کی تاویل بازیوں اور فتنہ آرائیوں کا تختۂ مشق رہا ہے لیکن اس کے ساتھ جو افسوسناک سلوک پاکستان کے تجدد پسند اصحاب کر رہے ہیں، اس کی داستان بڑی ہی الم انگیز ہے یہ کیرکٹر تو سمجھ میں آتا ہے کہ آدمی جس چیز کو نہ مانے، خم ٹھونک کر اس کی مخالفت کرے اور جس چیز کو مانے اس کے لیے جان کی بازی لگا دے۔ لیکن یہ کیرکٹر سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی ایک چیز پر ایمان کا دعویٰ کرے، اس کے خدائی اور آسمانی ہونے کا اقرار کرے اور دوسری طرف اس کے ایک ایک جز اور ایک ایک پہلو پر شبہات وارد کرے اور اس میں ترمیم کی تجویزیں بھی پیش کرتا چلا جائے۔

آج جس قسم کے سوالات ہمارے ہاں خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھائے جا رہے ہیں مثلاً یہ کہ ضبط ولادت اسلام میں جائز ہے یا ناجائز، مرد کو ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا اختیار ہے یا نہیں پردہ منشائے شریعت کے مطابق ہے یا مخالف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے احکام وقتی ہیں یا ابدی، ان میں سے کونسے ایسے ہیں جو ہنگامی ہیں اور کونسے ایسے ہیں جن کی پیروی تمام زمانوں میں، ہر قسم کے حالات میں لازم ہے۔ رقص و سرود اور عیش و طرب کی مجالس کے انعقاد کی اسلام کہاں تک اجازت دیتا ہے ... یہ سوالات عقل باور نہیں کر سکتی کہ کسی ایسے شخص کے ذہن میں پیدا ہو سکیں جو اسلام پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ سوالات تو صاف ایسے ذہنوں کی پیداوار ہیں جن کا اسلام سے کوئی ربط باقی نہیں رہا ہے لیکن وہ اسلام سے کھلم کھلا اپنی بغاوت کا اعلان اس وجہ سے نہیں کرتے کہ اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اسلام کو جتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں اور جتنا مسلمانوں کے ذہنوں کو الجھا سکتے ہیں اتنا وہ اس شکل میں نہیں کر سکتے جبکہ وہ اسلام سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیں۔

یہ سوالات جو آئے دن نت نئے فتنوں کی صورت میں ابھارے جاتے ہیں اُن کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ واقعی یہ ہمارے قومی مسائل ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے ہمارے بہی خواہانِ قوم سخت عذاب میں اور اُنہیں اس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ اگر ان کا بروقت حل تلاش نہ کیا گیا تو ہمارے سفینۂ حیات کو وقت کی بیرحم موجیں پاش پاش کر دیں گی۔ دراصل ان مسائل کو فتنوں کی شکل میں یہاں ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق زبردستی پیدا کیا جا رہا ہے کیونکہ اسلام کے بارے میں اب "منفر نجبین" کی دلی آرزوئیں پوری ہونے کی کوئی دوسری صورت بجز اس کے ممکن نہیں رہی ہے کہ اس کے اندر سے نقب لگائی جائے۔

اسلام کے راستے میں مزاحمتیں ماضی میں بھی پیش کی گئیں لیکن ماضی کے دشمن اتنے بزدل اور تھڑدلے نہ تھے جتنے کہ آج ہیں۔ وہ جب مخالفت کرتے تو بالکل کھل کر کرتے، بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کرتے۔ اور جب اسے قبول کرتے تو پھر اس میں بھی وہ مخلص ہوتے تھے۔ دشمن تو وہ بلاشبہ تھے لیکن ان میں چند بنیادی انسانی خصوصیات ایسی تھیں جن کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اُن کے مقابلہ میں آج کا دشمن بڑا ہی دون ہمت اور کم ظرف ہے۔ وہ سامنے آکر کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا بلکہ ہمیشہ چھپ کر شبخون مارتا ہے۔ اُس نے میدانِ جنگ میں کھڑے ہو کر لڑنے کی بجائے گوریلا وار کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہاں اسلام کا راستہ روکنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن اس مزاحمت میں بھی اُس کی روش بڑی ہی بزدلانہ تھی۔ اُس نے کبھی کھل کر یہ نہیں کہا کہ ہمیں اسلام نہیں چاہیے۔ اس کے بجائے اس نے ہزار حیلے بہانے بنا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کیے کہ دیکھو! اگر پاکستان کو اسلامی مملکت بنایا گیا تو اس کے یہ اور یہ نقصانات ہوں گے۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں کو یہ یقین ہی نہ رہے کہ آج دنیا میں اسلامی قانون کسی مملکت کی بنیاد بن سکتا ہے۔

جب اس کے یہ سارے حربے ناکام ہوئے اور قوم نے اس کے منہ سے یہ اگلوا ہی لیا کہ یہ سرزمین پاک اسلام ــــ اور صرف اسلام ــــ کے لیے وقف ہے اور یہاں کا نظامِ حیات وہی ہوگا

جو اللہ اور اُس کے رسول نے ہمیں دیا ہے تو اُن حالات میں ایک باضمیر انسان کی طرح اس گروہ کا فرض تھا کہ اگر اُسے یہ بات قابلِ قبول نہ تھی تو وہ میدان سے ہٹ جاتا لیکن اُس نے محض جاہ و منصب کے لالچ میں اپنے ضمیر کا خون کیا اور نظریاتی اختلاف کے باوجود مسندِ اقتدار پر متمکن رہا۔ مگر ابھی تک اس نے اپنی مخالفانہ روش نہیں چھوڑی بلکہ اس کی مسلسل کوشش یہی ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں نے ریاست کے اور اپنے درمیان اسلامی دستور کا جو بند باندھا ہے اور جس دستور کی وفاداری کا عہد کر کے اُسے اقتدار نصیب ہوا ہے، اس میں اب اتنے رخنے پیدا کر دیئے جائیں کہ مغربی معاشرت کا سیلاب اس کے اندر بڑی آسانی سے گھس آئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اب یہ بالکل چوہوں کی طرح اس حصار میں اِدھر اُدھر شگاف کرنے میں مصروف ہے۔ کبھی وہ شریعتِ اسلامی کے مجموعی ڈھانچے میں نہایت عیاری کے ساتھ چند ایسی چیزوں کو منتخب کرتا ہے جو جدید تہذیب و تمدن کے دلپسند رواج کے خلاف پڑتی ہیں اور انہیں موضوعِ سخن بنا کر مسلمانوں کے ذہن میں اختلال پیدا کیا جاتا ہے، کبھی علماء کو ہدف بنا کر امتِ مسلمہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے یہی لوگ وجہِ مصیبت ہیں، کبھی مسلمانوں کو نہایت ہی معصومانہ انداز میں یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ قرآن مجید میں لوگوں کو تفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے، اُس نے عقلِ انسانی پر کسی قسم کے پہرے نہیں بٹھائے تو ہم پھر پچھلوں کی لکیر کے فقیر بن کے کیوں رہ جائیں؟ یہ باتیں بظاہر بڑی دلکش ہیں لیکن ان کے پس پردہ جو عزائم ہیں وہ ایسے نہیں جن سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔ یہ ساری باتیں بالکل دوسرے مقاصد کے لیے کہی جاتی ہیں ــــ وہ مقاصد جو اسلام کی عین ضد ہیں۔

اِن صفحات میں ہم آج اسی مشرب کے ایک گُلِ سرسبد کے خیالات پیش کرتے ہیں جن سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کس حکمت اور دانائی کے ساتھ اسلام کے اندر رخنے پیدا کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔

چند روز ہوئے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں پاکستان کی عدالتِ عالیہ کے ایک معزز

رکن نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا :

" مجھے مولانا ابوالحسنات سید احمد کی تقریر کے اس حصہ سے اختلاف ہے جس میں مولانا نے کہا تھا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ضابطے اور قوانین موجود ہیں قرآن مجید واقعی ایک الہامی کتاب ہے اور اس میں حیاتِ انسانی کے متعلق ہدایات بھی ملتی ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ قرآن زندگی کے سارے شعبوں کے بارے میں احکامات دیتا ہے۔ اس نے معاشرت اور اخلاق کے متعلق چند اشارے کر دینے پر اکتفا کیا ہے اور ہمیں تاکید کی ہے کہ ہم عقل و فکر کی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنی زندگی کی تعمیر کریں یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں لوگوں کو تدبر اور تفکر کی دعوت دی گئی ہے۔

ہمارے قدیم فقہاء نے قرآن مجید سے استخراج کر کے اپنے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق احکامات مرتب کیے۔ وہ احکامات خواہ اپنے دور کے لیے کتنے ہی قیمتی اور مفید ہوں لیکن وہ عہد جدید کے مقتضیات کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمارے لیے از بس ضروری ہے کہ ہم اپنے دور کے لیے نئی فقہ مرتب کریں جس میں اسلام کی ایک ایسی تعبیر ہو جو موجودہ حالات سے مطابقت رکھتی ہو۔ امتدادِ زمانہ سے ملکوں اور قوموں کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں، تمدن کے نئے نئے تقاضے اُبھرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ماضی کے فقہی استنباط کو زمانۂ حال کے لیے قبول کر لینا صحیح اور درست نہیں "

صاحبِ موصوف کے یہ خیالات کچھ ایسے نہیں کہ لوگوں سے ڈھکے چھپے ہوں، ان خیالات کا اظہار انہوں نے کئی بار مختلف موقعوں پر کیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کریں۔

مندرجۂ بالا سطور کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ فاضل مقرر اپنے سامعین کو مندرجۂ ذیل تاثرات دینا چاہتے ہیں :

(ا) یہ کہ قرآن نے کوئی چیز تفصیل کے ساتھ نہیں بیان کی بلکہ چند اصولی باتیں بیان کر دی ہیں۔ اس کے بعد ہمیں تفکر و تدبر کی دعوت دے کر آزاد چھوڑ دیا ہے کہ ہم جو چاہیں اصول اور نظریے وضع کریں۔

(ب) جس معاملے میں قرآن نے ہمیں کچھ اصول دیے ہیں، اس میں تو ہمیں انہیں کی پیروی کرنی چاہیے لیکن اس باب میں احکامِ الٰہی کی جو تعبیر و توجیہ ہم کرنا چاہیں اس کا ہمیں پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ باقی رہے زندگی کے وہ معاملات جن کے بارے میں قرآن نے کوئی واضح حکم نہیں دیا اور جن کا تناسب اول الذکر سے کہیں زیادہ ہے، ہمیں صرف اپنے تفکر و تدبر پر اعتماد کرنا چاہیے۔

(ج) چونکہ ہمارے فقہا اور ائمہ ایک خاص دور اور علاقے میں رہے، اس لیے ان کی نگاہ صرف اُس دور یا علاقہ کے مادی حالات میں اُلجھی رہی۔ انہوں نے جو کچھ سوچا صرف اپنے عہد کے لیے سوچا اور جو کچھ کیا صرف اپنے وقت کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر کیا اس لیے فقہ کے جو مختلف مدارسِ فکر آج سے صدیوں پیشتر انسانی تمدن و اخلاق کی اصلاح کے لیے وجود میں آئے تھے وہ موجودہ ترقی یافتہ اور تبدیل پذیر حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے کیونکہ یہ مذاہب ایک خاص ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اسی ماحول کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، موجودہ زمانہ میں جب کہ حالات بالکل بدل گئے ہیں اور انسانی تمدن ایک نئے ارتقائی دور سے گذر رہا ہے، ان مذاہب کے قانونی احکام پر عمل کرنے کی کوشش بے سود اور لایعنی ہے۔

آئیے اب دیکھیں کہ ان ارشادات کے اندر اسلام کی مخالفت کے کیا کیا پہلو چھپے ہوئے ہیں۔

جب اس طرزِ خیال کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم میں واضح اور مفصل قوانین موجود نہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ضابطۂ حیات کے لیے پنسل کا ایک نہایت ہی مدھم سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے اور پھر انسانوں کو اس بات کی بالکل کھلی چھٹی دے دی ہے کہ وہ اس میں اپنے اپنے خیال کے مطابق جس طرح چاہیں رنگ آمیزیاں کرتے رہیں۔ یہ طرزِ فکر اسلام کے بالکل سطحی اور سرسری مطالعہ پر مبنی ہے۔ یہ حضرات اپنے سامنے اسلام کا صرف ایک پہلو رکھتے ہیں مگر دوسرے پہلو کو یکسر

نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ حقیقت غالباً ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ اللہ نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی تھی بلکہ ایک پیغمبر بھی مبعوث فرمایا تھا۔ اس ہادیٔ برحق نے خدا کی پیش کردہ اسکیم کے مطابق حیاتِ انسانی کا رفیع الشان قصر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ تعمیر کر کے دکھا دیا ہے۔ قرآنِ حکیم زندگی کے ایک ایک پہلو کے متعلق تفصیلی ضابطے اور قوانین بتانے کی بجائے صرف ہر شعبۂ زندگی کے حدود و اربعہ کو متعین کر دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگِ نشان کھڑے کر دیتا ہے جو اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق انسانی زندگی کی تعمیر کن خطوط پر ہونی چاہیے، لیکن ان ہدایات کے مطابق عملاً انسانی زندگی کی تشکیل اور صورت گری کرنے کا کام سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و راہنمائی کو نظر انداز کر کے صرف قرآن کے پیش کردہ خاکے میں سے زندگی کی ساری تفصیلات و جزئیات ڈھونڈنا سعی لاحاصل ہی نہیں بلکہ ایک زبردست گمراہی بھی ہے۔

اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید میں تدبّر و تفکّر کی دعوت دی گئی ہے، اور یہ اسی دعوت کا اعجاز تھا کہ مسلمانوں نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، فہم و ادراک کے گیسو سنوارے اور غور و فکر کو ترقی کے آخری زینے تک پہنچایا۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام نے جس عقل کی طرف دعوت دی ہے وہ دورِ جدید کی بنجر عقلیت پرستی سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اسلام نے دورِ جدید کے عقلیت پرستوں کی طرح عقل کو بے زمام نہیں چھوڑ دیا کہ وہ جدھر چاہے جائے اور جو چاہے کرے۔ اس نے خود عقل کو بھی اس کی حدود و قیود سے آگاہ کیا اور اسے ایک "عقلِ کل" کے تابع ہو کر چلنے کی ہدایت کی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار آیات مل سکتی ہیں لیکن ہم یہاں صرف دو نقل کرتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ...	جو لوگ اس رسول نبی امّی کی پیروی کرتے ہیں۔۔۔
... وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ	اور جنہوں نے اُس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (الاعراف - ۱۵۷)

اتارا گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (النساء - ۶۵)

پس نہیں تمہارے رب کی قسم (اے محمد!) وہ مومن نہیں ہیں جب تک کہ ان تمام جھگڑوں میں جو ان کے درمیان واقع ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں بلکہ تمہارے فیصلے کو سر بسر تسلیم کریں۔

قرآن مجید کی یہ تصریحات بالکل کھلے الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ ایک مسلمان کے لیے فلاح و کامرانی کا واحد معیار خداوند تعالیٰ کے احکام کا اتباع اور اس کے رسول کی سنت کی پیروی ہے۔ اُس کی عقل کی ساری تگ و تاز، اُس کے فہم و ادراک کی ساری جولانیاں صرف اسی ایک مقصد تک محدود ہیں کہ کسی طرح خدا اور رسول کا منشا معلوم کیا جائے۔ اسلام میں بھی تدبر اور تفکر قیمتی اور قابلِ صد ستائش ہے لیکن جہاں غور و فکر سے مراد یہ ہو کہ آدمی بالکل آزاد ہو کر مختلف وادیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے وہاں ضلالت اور گمراہی ہے اور ایسے فہم و ادراک سے ہر مسلمان کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

رہی فاضل جج کی یہ بات کہ فقہا کے سارے استنباط چونکہ اُن کے اپنے اپنے ماحول کی پیداوار تھے، اس لیے وہ وقتی اور عارضی ہیں، حیاتِ انسانی کے نہایت سطحی مطالعہ پر مبنی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی خارجی زندگی اور تمدنی ماحول میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم اصول و نظریات میں بھی تغیر کرتے چلے جائیں۔ انسان کا معاشرتی ارتقاء تجربہ کی بنیاد پر قائم ہے اور تجربہ کا تعلق ماضی ہی سے ہے۔ جب ایک انسان یہ کہتا ہے کہ ماضی کے خیالات و تصورات صرف اپنے اپنے زمانے تک محدود تھے اور حال اور مستقبل کے لیے وہ کوئی قیمت نہیں رکھتے تو پھر ہمیں لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے تجربات بالکل بے معنی ہیں کیونکہ تجربات کا سارا مواد گذشتہ واقعات ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہر آنے والی حالت گذشتہ حالتوں سے

نوعی اختلاف رکھتی ہے تو پھر یہ بات ناقابلِ فہم بن جاتی ہے کہ ایک انسان آنے والے حالات و واقعات میں اپنے گذشتہ تجربات سے کیونکر فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ ان تجربات کی ترتیب اُن احوال و واقعات کی بنیاد پر ہوئی ہے جنہیں آنے والی حالتوں سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ اس الجھن کو بعض لوگ یہ کہکر حل کرتے ہیں کہ نئے حالات میں عقل انسان کی راہ نمائی کرتی ہے۔ مگر اس میں پھر یہ دقت پیش آتی ہے کہ خود عقل تجربہ کا ایک وظیفہ ہے اُسے جو کچھ مواد ملتا ہے تجربہ ہی کے ذریعہ ملتا ہے اور تجربہ کے بغیر اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

اس معاملہ میں جتنا غور و فکر کیا جائے یہی معلوم ہوگا کہ انسان کا انفرادی یا معاشرتی تجربہ صرف اسی صورت میں مفید اور کارآمد ہے جب ہر نئی حالت اور گذرے ہوئے حالات میں کوئی اساسی فرق نہ ہو اور اگر ان کے مابین اختلاف کی نوعیت بنیادی ہو تو پھر ماضی کی ہر چیز ہمارے لیے عبث اور بیکار ہے اور اس قابل ہے کہ ہم اُسے دریا بُرد کر دیں۔ لیکن اصل صورت حال یہ نہیں، ماضی، حال اور مستقبل میں فرق کی نوعیت نوعی نہیں بلکہ سرسری ہے اور اسی بنا پر ہم حال اور مستقبل کی تعمیر ماضی پر کرتے ہیں یا زیادہ صحیح الفاظ میں یہاں ماضی ہی استقبال کا بھیس بدل کر حال کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس لیے ایک عقل مند انسان ماضی سے انحراف نہیں کرتا بلکہ حال کی ترکیب و تشکیل ماضی کی اساس پر کرتا ہے۔ آج جو محرکات ہمیں تعمیر و تخریب کی طرف لے جاتے ہیں وہ اُن محرکات سے بالکل مختلف نہیں جو گذشتہ زمانوں کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمارے اسلاف کے استنباط ہمارے لیے اسی طرح کارآمد ہیں جیسے کہ ہمارے اپنے عہد کے علما کے۔

پھر اس طرزِ استدلال میں دوسری غلطی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں اسلام کے اساسی فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ فلسفہ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ انسانی ذہن کی افتاد کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ماوراء سرحدادراک کو کھینچ تان کر محسوسات کے دائرے میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کا ذہن مافوق الطبیعی

حقائق کو بھی عالمِ طبیعی کے خم و پیچ میں گرفتار کرنے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ یہ غالباً اسی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے کہ یونانیوں نے اپنے خداؤں تک کو عصریت اور ارضیت کے لباسوں میں ملبوس کر کے انہیں اہلِ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اسلام نے اس طرزِ فکر کو بالکل غلط قرار دیتے ہوئے، اس کے برعکس بالکل دوسرا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اُس کے نزدیک نہ صرف خالقِ کائنات ہر قسم کی مادی آلائشوں سے پاک اور منزہ ہے بلکہ اُس کے رسول کی سنّت بھی زمان و مکان کی ساری حدبندیوں سے آزاد ہے۔ اسلام نے دنیا پر یہ راز پوری طرح آشکار کر دیا ہے کہ جس طرح قانونِ طبیعی کے مطابق یہ کائنات ایک وحدت ہے اسی طرح قانونِ شرعی کی رو سے بھی یہ ایک ہی ہے۔ امروز و فردا کے درمیان جو حجابات ہمیں نظر آتے ہیں وہ محض ہماری نظر کا دھوکا ہیں ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

چنانچہ دیکھیے مسلمانوں کے ہاں آج تک جتنے ائمہ و صلحاء اور مجتہدین گزرے ہیں انھوں نے یہ نہیں کہا کہ تم ہمارے اقوال کو زمان و مکان کے مصالح پر پرکھ کر دیکھو اگر وہ ان پر پورے اتریں تو انہیں قبول کر لو اور اگر وہ اس کے مطابق تمہیں نظر نہ آئیں تو انہیں رد کر دو۔ ان بزرگانِ امت نے جس بات پر اپنا سارا زور صرف کیا وہ یہ تھی کہ تم منشائے رسول معلوم کرنے کی کوشش کرو اور اگر کوئی چیز اُس کے خلاف پاؤ تو اسے رد کر دو۔ ہم یہاں ان بزرگوں کے چند اقوال پیش کرتے ہیں :

امام شافعی فرماتے ہیں :

فبما قلت من قول او اصلت من اصل فبلغ عن رسول اللہ خلاف ما قلت فالقول ما قالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں جو بات بھی کہوں اور جو اصول بھی ٹھہراؤں جب اس کے خلاف کوئی بات رسول اللہؐ سے مل جائے تو پھر حضور ہی کی بات اصل ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں یہ قطعی فیصلہ صادر فرما دیا :

لیس لاحد مع اللّٰہ ورسولہ کلام۔ — اللہ اور رسول کی بات کے ہوتے ہوئے کسی کی بات کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

امام مالک کا قول ہے:

ما من احد الا ھو ماخوذ من کلامہ ومردود علیہ الا رسول اللّٰہ — رسول اللہ کے سوا ہر شخص کے کلام میں قابلِ اخذ اور قابلِ ترک باتیں ہیں۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے:

لا ینبغی لمن لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی — جو شخص یہ نہ معلوم کر سکے کہ ایک بات میں نے کتاب و سنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی ہے وہ میرے قول پر فتویٰ نہ دے۔

ائمہ کرام کے یہ اقوال اس حقیقت کے پوری طرح آئینہ دار ہیں کہ ایک مسلمان احکامِ الٰہی میں جس چیز کی تلاش و جستجو کرتا ہے وہ اپنے دل پسند افکار و نظریات کی تائید نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کی موافقت ہے۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ چونکہ فقہ اسلامی کی تدوین کرنے والے علماء ایک مخصوص زمانے سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف ممالک کے رہنے والے تھے اس لیے ان کی رائے ہمارے زمانوں کے لیے حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتی، بالکل غلط ہے اور ایسا تصور بالکل خود فریبی پر مبنی ہے۔ ہم ائمہ سلف کے اجتہاد کو صرف اس لیے پسِ پشت نہیں ڈال سکتے کہ ان کا زمانہ اور تھا اور ہمارا زمانہ اور ہے، وہ کسی خطۂ زمین سے تعلق رکھتے تھے اور ہم بالکل ایک دوسری سرزمین میں بستے ہیں۔ اسلامی اجتہاد میں زمان و مکان کا فرق اصل اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم ان ائمہ اور مجتہدین کی اگر کسی بات کو ٹھکرانے کے مجاز ہیں تو صرف اس صورت میں جبکہ احکامِ الٰہی اور سنتِ نبوی میں ان کی دلیل سے محکم تر کوئی دلیل ہمیں مل جائے۔ اس لیے اسلام میں کسی کے اجتہاد کو وقتی مصلحتوں کے معیار پر جانچنے کی بجائے اُسے تعلیماتِ رسول پر پرکھا جاتا ہے۔ اگر کسی امام کا استنباط احکامِ الٰہی اور سنت خیر البشر کی کسی محکم بنیاد پر قائم ہے تو وہ بھی بالکل اٹل اور ناقابلِ تغیر ہے۔ اگر سارے

یہاں کے لوگ بھی مل کر اس میں مصلحت کے پیشِ نظر کوئی ردّ و بدل کرنا چاہیں تو انہیں یہ حق نہیں پہنچتا۔

ان گزارشات سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہمیں سرے سے وقت اور حالات کے تغیّر و تبدّل کی اہمیت ہی سے انکار ہے۔ ہمارا منشا صرف اسی قدر ہے کہ تعلیماتِ الٰہی زمان و مکان اور اُس کے مصالح کی پابند نہیں وہ ہمہ گیر اور آفاقی ہیں۔ فقہا نے جو یہ اصول پیش کیا ہے کہ الاحکام تتغیر بتغیر الزمان تو یہ عام طور پر ہر قسم کے قوانین کے متعلق درست نہیں بلکہ یہ انہیں چیزوں کے متعلق صحیح ہے جن پر زمانہ اور وقت کی چھاپ نہایت گہری ہو اور جن کی بنیاد خالصۃً عرف یا مصلحت پر ہو۔ مثلاً ملک کی صنعتی ترقی کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا، ملازمین کے اوقات متعین کرنا، یا ٹکسال وغیرہ کا انتظام و انصرام کرنا، یا ریل گاڑیوں کا انضباط۔

بےجا نہ ہوگا اگر ہم یہاں اجتہاد کے بارے میں ایک بالکل انوکھے نقطۂ نظر کا بھی تذکرہ کر دیں۔

آج تک اجتہاد کے لفظ سے امتِ مسلمہ جو کچھ سمجھتی رہی ہے وہ ہے دین کے اصلی سرچشموں سے احکام مستنبط کرنا۔ اس سلسلے میں جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کا عامل اور قاضی بنا کر بھیجا۔ جب وہ روانہ ہونے لگے تو آپ نے دریافت فرمایا:

کیف تقضی اذا عرض لك قضاءٌ؟	معاذ! تم ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کیسے کرو گے؟
قال: اقضی بکتاب اللہ!	عرض کیا: کتاب اللہ سے!
قال: فان لم تجد فی کتاب اللہ	ارشاد ہوا: اگر اس میں نہ ملا تو؟
قال: فبسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	بولے: سنّت رسول اللہ سے!
قال: فان لم تجد فی سنة رسول اللہ	فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملا، تو؟
قال اجتھد برأیی ولا آلو	جواب دیا: پھر میں اجتہاد سے کام لونگا اور اپنی سی

کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھونگا (یعنی میں اجتہاد میں حق و صواب کی تلاش میں اور روح شریعت سے قریب تر پہنچنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرونگا)

سرکار رسالتؐ یہ جواب سُن کر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو اپنی خوشنودی حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

یہ ایک واقعہ اجتہاد کی حدود اور طریق کار کو متعین کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے ائمہ اور فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ اجتہاد کی بنیاد احکام الٰہی اور اسوۂ رسولؐ ہے اور ان دونوں سے صرف نظر کر کے اسلام کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے کوئی اجتہاد نہیں کیا جا سکتا ہے۔

علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی لغوی تعریف کرنے کے بعد اس کی فنی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"اصولیوں کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے اس انتہائی کوشش کے لیے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان حاصل کرنے کے لیے صرف کی جائے کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔"

امام شاطبیؒ کی الموافقات میں اجتہاد کی یہ تعریف ہے:

"اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا۔"

اسی طرح صبحی محمصانی نے اپنی تصنیف فلسفہ التشریع فی الاسلام میں اجتہاد کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"لغت میں اجتہاد کے معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش کرنا ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جائے یعنی دین کے ان سرچشموں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، احکام استنباط کرنے کی سعی کرنا۔"

پھر دور جدید کے دو بہت بڑے علما مصطفےٰ احمد زرقا اور محمد ابو زہرہ نے اسلامی کلوکیم میں اجتہاد کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ بھی مندرجہ بالا تعریحات کے عین مطابق ہے۔

مصطفیٰ احمد زرقا صاحب اجتہاد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اجتہاد نام ہے نو بہ نو واقعات و مسائل میں شریعت کے تفصیلی دلائل سے شرعی احکام مستنبط کرنے کا۔"

محمد ابو زہرہ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فقہ اسلامی میں اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ فقیہ دلائل شرعیہ سے عملی احکام مستنبط کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔"

ہم نے علمائے قدیم و جدید کے جو اقوال نقل کیے ہیں اُن سے ہمارا مقصد اس امر کی وضاحت کرنا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں آج تک اجتہاد کا جو تصور پایا جاتا رہا ہے وہ صرف ایک ہی ہے کہ زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں رضائے الٰہی اور منشائے رسول کو معلوم کیا جائے۔ یہ دونوں وہ اصل بنیادیں ہیں جن پر اجتہاد کی عمارت تشکیل پاتی ہے اور اگر ان بنیادوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر وہ اجتہاد اسلامی نقطۂ نظر سے اجتہاد نہیں رہتا بلکہ وہ محض آزاد خیالی بن کے رہ جاتا ہے۔ یہ چیز ایک غیر مسلم کی نظر میں تو ممکن ہے کسی حد تک پسندیدہ ہو لیکن یہ بات کسی ایسے مسلمان کو زیب نہیں دیتی جس نے خدا کو اپنا حاکم اور رسول کو اپنا ہادی اور مطاع تسلیم کیا ہے۔

لیکن اسے ہماری بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ آج ایسے ایسے مدعیانِ علم دین پیدا ہو رہے ہیں جو اجتہاد کے معاملہ میں نصوص تک کو نظر انداز کر دینے کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس قسم کے خیالات کا چند روز پیشتر ایک عالم دین کی طرف سے اظہار کیا گیا ہے۔ وہ دائرہ اجتہاد کی وسعتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکثر حضرات نے بربنائے مصلحت نصوص سے متعلق معقول روش اختیار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے یہ کہا ہے کہ اجتہاد و فکر کی تگ و تاز صرف انہی مسائل تک محدود رہے گی جو کتاب و سنت میں مذکور نہیں ہیں اور جن مسائل کے بارے میں کتاب و سنت کی تصریحات پائی جاتی ہیں ان سے متعلق کوئی مسلمان غور و فکر کرنے کا مجاز نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر مجمل ہے اور اس سے زندگی

کے موجودہ مسائل کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ خود اجتہاد کے حدود و استناد کا تعلق اجتہاد سے ہے جس میں بہرحال دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ اس بنا پر یہ کیونکر جائز ہو گا کہ صرف ایک ہی پہلو کی صحت پر اصرار کیا جائے"

فاضل مقالہ نگار پھر اپنے اس نظریہ کی تائید میں چند تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مزید برآں تاریخی نقطۂ نظر سے بھی یہ موقف صحیح نہیں۔ حضرت عمرؓ نے تطلیقات ثلاثہ کے متعلق جو فیصلہ کیا یا اراضی سواد کی تقسیم کو جو عمومی مصالح کے پیش نظر رد کیا اس سے کسی طرح بھی اس زاویہ نگاہ کی تائید کا سامان بہم نہیں پہنچ پاتا"

مندرجۂ بالا اقتباسات کو ذرا غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ امتِ مسلمہ کو کس چیز کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اسے یہاں سمجھایا یہ جا رہا ہے کہ نصوص پر بھی وقتی مصلحتوں کے پیش نظر اجتہاد کی قینچی چلائی جا سکتی ہے اور اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بھی ایک مسلمان اپنے ضابطہ حیات کی تشکیل کر سکتا ہے۔

اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اجتہاد کی بنیاد کیا ہے۔ اگر اس کی بنیاد صرف عمومی مصالح ہیں تو پھر اسلامی اجتہاد اور آزاد رائے میں کوئی فرق بجز اس کے باقی نہیں رہتا کہ مسلمانوں نے اپنی قانون سازی کا نام اجتہاد رکھ چھوڑا ہے اور دوسرے اسی مفہوم کو اپنی اپنی زبانوں اور اپنی بولیوں میں دوسرے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو پھر امریکی پارلیمنٹ، برطانوی ایوانِ عام اور بھارت لوک سبھا کی قانون سازی سب گویا اسلامی اجتہاد ہی ہیں کیونکہ ان کے اراکین کے پیش نظر بھی اپنی اپنی قوم کے عمومی مصالح ہی ہوتے ہیں۔ اسلام میں اجتہاد نصوص کے تضمنات پر کیا جاتا ہے اور اگر اجتہاد اپنی بنیادوں کو خود اپنے ہاتھوں سے مسمار کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو پھر کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جو "فقیہ مصلحت بیں" کے خیالات و تصورات پر پابندی عائد کرے۔

فاضل مقالہ نگار نے اجتہاد کے نصوص کے بارے میں "اجتہاد" کا جو مسلک پیش کیا ہے وہ بڑا

گمراہ کن ہے۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ اپنے دعوے کی تائید میں جو واقعات انھوں نے بیان کیے ہیں وہ ان کی تصدیق کرنے کی بجائے اُن کے بالکل مخالف پڑتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تطلیقاتِ ثلاثہ کے متعلق جو فیصلہ کیا یا اراضی سواد کی تقسیم کو جن مقاصد کے پیش نظر روکا وہ قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول کی ضد نہ تھے۔ بلکہ تعلیماتِ الٰہی کے عین منشا کے مطابق تھے۔ آپ نے ان دونوں فیصلوں کی بنیاد نصوص پر رکھی۔

تطلیقاتِ ثلاثہ کے باب میں جو احادیث وارد ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ دعویٰ تو بالکل غلط معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے عہدِ مبارک میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھیں۔ حدیثیں دونوں طرح کی ملتی ہیں۔ زیادہ ایسی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک مجلس کی تین یا تین سے زائد طلاقوں کو بائن قرار دیا گیا اور بعض ایسی بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا گیا۔ ہم یہاں صرف دو احادیث پیش کرتے ہیں:

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ حبیب بنی عجلان کے بھائی نے اپنی بیوی سے لعان کیا تو اس نے کہا یا رسول اللہ، میں بڑا ہی ظالم ہونگا اگر اس کے بعد بھی اس کو بیوی بنائے رکھوں۔ سو اب میری طرف سے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔ (رواہ احمد)

"عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی ایک بیوی کو بیک وقت ہزار طلاقیں دے دیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے دادا نے خدا کا خوف نہیں کیا۔ ان میں سے تین اُن کا حق تھا بقیہ ۹۹۷ سب ظلم و زیادتی ہیں۔ اگر اللہ چاہے گا تو معاف کر دیگا اور اگر چاہے گا تو سزا دیگا۔"

یہ دونوں حدیثیں اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کسی نص کو منہدم کر کے کوئی اجتہاد نہیں کیا بلکہ اپنے فیصلے کی بنیاد سنتِ نبوی پر رکھی۔

صاحبِ موصوف نے اراضی سواد کی تقسیم کے بارے میں حضرت عمرؓ کی جس پالیسی کا ذکر کیا ہے

اُن کے دعوے کی کسی طرح بھی مؤید نہیں۔ حضرت عمرؓ نے جن عمومی مصالح کے پیش نظر عراق و شام کی زمینوں کی تقسیم کی، اُس کی بنیاد بھی تعلیمات الٰہی ہی تھی۔ اس تصفیہ میں نہ تو سیدنا عمرؓ کے ذاتی رجحانات کا دخل تھا اور نہ ہی عمومی مصالح ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت سے اس میں شامل تھے۔ ان زمینوں کی تقسیم پر جو اختلاف رائے ہوا اُس کا آخری اور قطعی فیصلہ احکامات الٰہی سے ہی حاصل کیا گیا۔ اس پورے واقع کی تفصیلات کتاب الخراج اور کتاب الاموال میں مل سکتی ہیں۔ یہاں ہم اس پوری بحث کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ کیا کوئی اجتہاد قرآن اور سنت رسول سے صرف نظر کر کے بھی کیا جا سکتا ہے۔

عراق و شام فتح ہو جانے کے بعد زمین اور جائداد کے انتظام کے بارے میں مشورہ ہوا۔ مجلس شوریٰ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت بلالؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں کی رائے تھی کہ یہ زمینیں فوجیوں میں تقسیم کر دی جائیں جس طرح رسول اللہ نے خیبر کا کچھ حصہ فوجیوں میں تقسیم کیا تھا۔

امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی رائے اس کے خلاف تھی، وہ چاہتے تھے کہ خلافت کے زیر انتظام زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جائے۔ مجلس شوریٰ کے دیگر ممبر حضرت علیؓ، حضرت ابن عمر، حضرت طلحہؓ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت عثمان غنیؓ جیسے اکابر صحابہ کی رائیں حضرت عمرؓ کی موافقت میں تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اس فیصلے کی تائید میں فرمایا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ ہی لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد میں آنے والوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہو۔ کیا آپ لوگوں کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور اس طبقہ میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی؟ بیواؤں اور حاجتمندوں کی کفالت کہاں سے ہو گی؟ مجھے اس کا بھی اندیشہ ہے کہ بعض لوگ پانی کے بارے میں آپس میں فساد کریں گے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے اپنے زوردار الفاظ میں حضرت عمرؓ کے اس موقف کی تائید کی۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ کے ان سارے دلائل کو جن کی تائید کسی نص سے نہ ہوتی

تھی، بعض صحابہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت عبدالرحمنؓ اور حضرت بلالؓ کا مطالبہ یہ تھا:

"جو مال اللہ نے ہمیں غلبہ سے عطا فرمایا ہے۔ وہ ہم لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ جس طرح رسول اللہ نے خیبر تقسیم کر دیا تھا۔ یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں ان کے بیٹوں اور پوتوں کے خیال سے ہماری حق تلفی کی جائے۔ ہم اپنی ذریت کے لیے ہیں اور بعد والے اپنی ذریت کے لیے ہوں گے۔"

حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عبدالرحمن اور حضرت بلال کی اس دلیل کو عمومی مصالح کے پیش نظر رد نہیں کیا، حالانکہ جلیل القدر صحابہ کی اکثریت خلیفۂ دوم کی ہمنوا تھی۔ انھوں نے بجائے اپنا فیصلہ قوت کے زور سے نافذ کرنے کے احکامِ الٰہی سے تائید حاصل کرنے کی سعی کی۔ اس سلسلہ میں سیدنا عمرؓ نے جو تقریر فرمائی وہ ان کے فہم و ادراک، اُن کی کتاب و سنت سے والہانہ محبت اور اُن کی دقتِ نظر اور وسعتِ قلب کی ایک بہت بڑی شہادت ہے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا:

"میں نے آپ حضرات کو محض اس لیے تھوڑی تکلیف دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ ہی لوگوں نے میرے سر پر رکھا ہے اُس کے اٹھانے میں میرے شریک ہوں۔ اس وقت مجلس میں میری پوزیشن خلیفہ کی نہیں ہے بلکہ آپ میں کے ہر فرد جیسی ہے۔ ہر شخص کو اپنی اپنی رائے پیش کرنے کا بالکلیہ اختیار ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے کہ اس معاملہ میں مشورہ ہو چکا ہے۔ مجلس کے کچھ لوگوں نے میری رائے کی مخالفت کی ہے اور کچھ نے موافقت کی ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ میری مرضی کا اتباع کریں اور حق بات کو چھوڑ دیں میں تو صرف ایک حق بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس طرح میرے پاس اللہ کی کتاب ہے۔ ویسے ہی آپ لوگوں کے پاس بھی اللہ کی کتاب موجود ہے جو ناطق بالحق ہے اس کو سامنے رکھ کر مجھے مشورہ دیجیے جو کچھ اس میں موجود ہے اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے۔"

اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دعوے کی تائید میں سورۃ الحشر کی مندرجہ ذیل آیات پیش کیں

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ- وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ- وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ- (الحشر: ۸-۱۰)

یہ فے کا مال ان مفلس مہاجروں کے لیے ہے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے، جن کے مال چھین لیے گئے، جو اللہ کے فضل اور اس کے خوشنودی کے طالب ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں۔ اور یہ مال ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو پہلے سے اس گھر (مدینہ) میں ایمان کے ساتھ جاگزیں تھے، جو محبت کرتے ہیں ان لوگوں سے جو ان کی طرف ہجرت کرکے آئیں، جن کا حال یہ ہے کہ مہاجرین کو خواہ کچھ بھی دیا جائے وہ اس کی پروا نہیں مانتے، بلکہ اپنی جانوں پر اُن کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ اُن پر فاقہ ہی کی نوبت آجائے۔ اور جو لوگ اپنے نفس کے لالچی پن سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اور یہ مال ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان کے بعد آئیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو تقسیم نہ کرنے کا جو فیصلہ صادر فرمایا، اُس کے لیے انھوں نے قرآنِ حکیم کی اس آخری آیت وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ سے استدلال کیا۔ حضرت عمر کے اس استدلال سے سب نے مکمل طور پر اتفاق کیا اور کہا کہ بس آپ ہی کی رائے اس معاملہ میں درست ہے۔

اس فیصلہ کے بعد حضرت عمرؓ نے اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا:

"اب مجھے اطمینان ہوا کہ میں حق پر تھا اور اس معاملہ میں میری رائے درست تھی۔"

قاضی ابو یوسف اس فیصلہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنی تصنیف کتاب الخراج

اسلام اور طرز معاشرت

(از پروفیسر لبیب السعید مصری)

(اسلام ایک ایسا مکمل دین ہے کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعمیر کرے اُس کو ہر آن اس کے مفید نتائج حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف آخرت میں فائز المرام ہوتی ہے بلکہ اس دنیا میں بھی اُسے طمانیت اور آسودگی کی دولت سے بہرہ ور کیا جاتا ہے۔ اس دین سے اگر ایک طرف فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی اخلاق میں پاکیزگی اور روح میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے، تو دوسری طرف معاشرت میں حسن سلوک تہذیب میں نفاست، معیشت میں عدل و مواسات اور طرز بود و ماند میں طہارت اور نظافت ایسی صفات پرورش پاتی ہیں۔ مندرجہ ذیل مضمون میں پروفیسر لبیب السعید مصری نے بڑی عمدگی سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام نے طرز معاشرت میں اپنے پیروؤں کو کیا تعلیمات دی ہیں۔ ادارہ)۔

اسلام بنیادی ضروریاتِ زندگی کا ضامن ہے غذا، لباس، اور مکان انسان کی وہ بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن پر انسانی زندگی کے قیام و بقا کا دارومدار ہے جس طرح کسی انسانی معاشرے کے معیدا اور باعثِ خیر ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد ان بنیادی ضروریات سے محروم نہ ہو اسی طرح معاشرے کے فاسد اور شقی ہونے کا پیمانہ بھی یہ ہے کہ اس کے کچھ افراد اور اس کی عمارت کے کچھ اجزاء حوائج حیات سے تہی دست ہوں اور کوئی ان کا ضامن یا پرسانِ حال نہ ہو۔ اسلام معاشرتی انصاف کے جن اصولوں کا علمبردار ہے اُن میں سب سے سرفہرست یہ اصول ہے کہ وہ انسان کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کی ضمانت دیتا ہے۔ اس فراہمی کے لیے وہ دو ذرائع اختیار کرتا ہے ایک طرف تو وہ اپنی مرتزا خلاقی تعلیم اور اجتماعی مزاج کی مدد سے عام شہر لوں کے اندر یہ ذوق پیدا اور بڑھاتا ہے کہ ان میں

جو لوگ صاحب ثروت اور کشادہ دست ہوں وہ اپنے غریب اور نادار بھائیوں، حاجتمند رشتہ داروں اور بستی کے بے سہارا افراد کو ضروریات زندگی سے محروم نہ رہنے دیں (وفی اموالھم حق للسائل والمحروم)۔ ان کے ذہن میں یہ حقیقت مختلف طریقوں سے جاگزیں کرتا ہے کہ من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ (جو اپنے مسلمان بھائی کی حاجت بر آری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجت برآری کرتا ہے)، اور دوسری طرف اسلام حکومت کے فرائض میں یہ بنیادی ذمہ داری شامل کرتا ہے کہ وہ ملک کے اغنیاء اور مالدار لوگوں سے زکوۃ وعشر وغیرہ وصول کرکے ملک کے صاحب حاجت اور مساکین وفقراء کی کفالت کا انتظام کرے۔ خذ من اغنیاءھم وترد الی فقراءھم (ریاست کے مالداروں سے لو اور فقراء اور ناداروں کو دو) اسلامی حکومت کا وہ شعار ہے جس کی پابندی از روئے دستور اس پر عائد ہوتی ہے۔ حاجتمند افراد کی کفالت کا دائرہ صرف روٹی اور تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا مہیا کر دینے تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کے لیے رہائشی مکانات کی فراہمی بھی اسی دائرے میں داخل ہے۔ ان مکانات کی نوعیت علامہ ابن حزم ظاہری کے الفاظ میں یہ ہے:

تکنہم من المطر والصیف والشمس وعیون المارۃ[1] — یہ مکانات ایسے ہونے چاہئیں جو رہنے والوں کو بارش، گرمی اور دھوپ سے اور گزرنے والوں کی نگاہوں سے چھپائے رکھیں۔

رہائشی مکانات کی فراہمی حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے — علاوہ ازیں عام شہریوں کو رہائشی مکانات کی قلت سے بچانا اور انہیں اس بارے میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچانا ایک ایسا تمدنی و معاشرتی فریضہ ہے جسے اسلامی حکومت محض ہنگامی حالات کے دباؤ سے سرانجام نہیں دیتی بلکہ اس کا عام ملکی قانون مستقل طور پر اسے اپنا ہدف قرار دیتا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ نے صدر حکومت کے دو فرائض بیان کیے ہیں، ان میں سے ایک سیاسۃ الناس (ملک کا سیاسی انتظام) ہے اور دوسرا عمارۃ الارض

[1] المحلی ج ۶ ص ۱۵۶

کی تشریح میں امام موصوف لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ملک میں تعمیر و تمدن کے واجبات پورا کرنا، زراعت کی توسیع، شاداب درختوں اور چمن زاروں کی آبیاری، شہروں کا قیام، آبادیوں اور مکانوں کی تشکیل و توفر اور معاشی اصلاح و خوشحالی ہے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے فقہاء نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ کسی مالک مکان کو اپنا مکان منہدم کرنے کی اجازت نہیں ہے اگر اس کے انہدام سے اہل محلہ کو تکلیف کو سامنا کرنا پڑتا ہو الا یہ کہ وہ اُسے از سر نو بنانا چاہتا ہو۔[۲]

شریعت اسلامی میں طہارت و حفظان صحت کی اہمیت عوام الناس کی سکونتی ضرورت کو پورا کرنے کے ساتھ شریعت اسلامی تعمیر مکانات اور آبادیوں کی خاکہ کشی میں حفظان صحت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتی ہے۔ یہ اصول طہارت و نظافت اور حفاظتِ جان و مال کے ان احکام و تعلیمات سے ماخوذ ہیں جن کی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر ہدایت فرمائی ہے۔ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے نبوت میں اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمایا تھا کہ وثیابك فطھر (اور آپ اپنے کپڑوں کو پاک کریں)۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان اللہ یحب المتطھرین (اللہ تعالیٰ پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔ پیغمبر خدا کا ارشاد ہے الطھور شطر الایمان (پاکیزگی آدھا ایمان ہے)۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "ہمعات" میں معتدل اور متوازن معاشرے کی خصلتوں کو بیان کرتے ہوئے ایک خصلت "طہارت" بھی بیان فرمائی ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> "مسلم معاشرے کی ایک خصلت طہارت ہے۔ اس کی حقیقت اور اس کی طرف میلان سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ یہاں یہ گمان نہ کر لینا کہ طہارت سے مراد وضو اور غسل ہے، بلکہ طہارت کا اصل مقصد وضو اور غسل کی روح اور اس کا نور ہے۔ جب آدمی نجاستوں میں آلودہ ہو، میل کچیل میں ملوث ہو۔ بول و براز نے اس کے معدہ میں گرانی پیدا کر رکھی ہو تو لازماً وہ انقباض اور حزن اپنے اندر پائے گا اور جب ماحول کو ستھرا رکھے گا، غسل کریگا اور نیا لباس زیبِ تن کرے گا تو اسے اپنے نفس میں انشراح اور سرور محسوس ہوگا۔ حاصل کلام یہ

---

[۱] الذریعہ الی مکارم الشریعۃ ص ۱۹۰،۱۴۱ [۲] فتاویٰ القروبہ ج ۱ ص ۲۶۶

روحانی ایک وجدانی کیفیت ہے جو نور سے تعبیر کی جا سکتی ہے اور اس وجدانی کیفیت میں جو باتیں خلل انداز ہوں ان سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔"

تعمیر مکانات میں حفظانِ صحت کے اصولوں کا لحاظ یہ طہارت اور پاکیزگی صرف جسم اور لباس تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قریبی ماحول، مکان اور محلِ سکونت بھی اسی کے ضمن میں داخل ہیں چنانچہ مکانوں اور بستیوں کی پلاننگ اور وضع و ساخت میں بعض امور کا لحاظ ضروری ہے، ان کے متعلق علامہ ابن خلدون کی تصریح یہ ہے کہ:

"شہروں اور آبادیوں کی تعمیر و ساخت کے بارے میں سب سے پہلے جس چیز کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ تازہ اور پاک ہوا ہے تاکہ لوگ بیماریوں اور آفاتِ سماوی سے محفوظ رہیں۔ اگر تازہ ہوا کا دخول اور گندی ہوا کا اخراج نہ ہوتا ہو اور مکان کے اندر تعفن پیدا ہو جائے یا آبادی گندے جوہڑوں، بدبودار چشموں، سڑے ہوئے کھیتوں کے پاس ہو اور غلیظ ہوا مکانوں میں داخل ہوتی ہو تو یقیناً ان مکانوں میں رہنے والے لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گے ... جن شہروں اور قصبوں میں تازہ ہوا کے حصول کا اہتمام نہیں کیا جاتا وہ اکثر امراض و آلام کی زد میں رہتے ہیں[1]۔"

آگے چل کر علامہ ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ اگر کسی بستی کو رفاہِ عامہ کے ضمن میں پانی کا قرب اور مویشیوں کے لیے عمدہ چراگاہیں حاصل ہیں تو وہ بستی لازماً تکالیف اور مشقتوں سے نکل کر آرام اور نفع اندوزی سے بہرہ مند ہوگی[2]۔

اسلامی تاریخ میں حفظانِ صحت اور رفاہِ عامہ کا اہتمام تاریخ کے تتبع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سوسائٹی نے سکونتی مقامات اور آبادیوں کی تعمیر میں اپنی اسلامی روح کے تقاضے کے مطابق طہارت و نظافت اور حفظانِ صحت کی تدابیر پر بالالتزام عملدرآمد کیا ہے۔ بلکہ اس نے طبعی حالات کی مساعدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سلسلے میں حیرت انگیز مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ حفظانِ صحت کی تدابیر

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۸۹ [2] ایضاً ۳۹۰

میں صاف اور نظیف پانی کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے، مسلم سوسائٹی نے اس کی اہمیت کو جس پیمانے سے ناپا ہے اُس کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ اموی دور میں دمشق میں ہر گھر کے اندر نہر بُرَدی کا پانی پہنچتا تھا۔ مرحوم امیر علی نے مسلمانوں کے اس اہتمام و انصرام پر انگشت بدنداں ہو کر لکھا ہے؛

"نہر بَرَدی[1] اگرچہ شہر کو فراوانی سے پانی سپلائی کرتی تھی، مگر اس کے باوجود ان لوگوں نے اپنے عدیم المثال مہارت کا مظاہرہ کیا۔ ہر گھر کے اندر پانی کے لیے ٹینک بنا دیئے جن سے نہایت صاف و شفاف پانی نکلتا تھا۔ سات بڑی جدولیں تھیں جو شہر کے مختلف گوشوں میں بہتی تھیں اور مختلف نالے ان میں سے نکل کر گھروں کے اندر بنے ہوئے ٹینکوں میں پانی پہنچاتے تھے"[2]

ایرانی سیّاح ناصر خسرو (۱۰۰۳ — ۱۰۶۰) نے اپنے سفرنامہ میں مسجد اقصیٰ کی زیارت پر لکھا ہے کہ

"مسجد میں رانگ کے بنے ہوئے نل ہیں جن میں سے پانی نکل کر نیچے پتھر کے حوضوں میں گرتا ہے۔ ان حوضوں میں سوراخ بنے ہوئے ہیں جن سے پانی نکل کر نالیوں کے ذریعے سے مختلف ٹینکیوں میں تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ پانی کسی مقام پر گدلا اور متعفن نہیں ہوتا۔"

دیگر مسلمان ملکوں میں بھی اس قسم کے رفاہ عامہ کے کاموں پر غیر معمولی توجہ دی گئی ہے۔ اس سے عام شہریوں کو سہولت میسر ہونے کے ساتھ حفظانِ صحت کا مقصد بھی حل ہو جاتا تھا۔ اسی سیّاح ناصر خسرو نے فارس کی مسجد میافارقین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے؛

"مسجد کی وضو گاہ کی جانب چالیس بیت الخلاء بنے ہوئے ہیں جن کے آگے سے دو بڑی بڑی پانی کی نالیاں بہتی ہیں۔ ایک اوپر کی جانب کھلی ہوئی ہے تاکہ اس کا پانی طہارت کے لیے استعمال کیا جا سکے اور دوسری زیرِ زمین دوز ہے اور غلاظت کو بہانے کے لیے ہے۔"

---

[1] شام کی مشہور نہر ہے، زبدانی سے نکلتی ہے اور دارالحکومت دمشق اور نواحی مقام غوطہ دمشق کو سیراب کرتی ہوئی جھیل عتیبہ میں جا گرتی ہے۔

[2] مختصر تاریخ عرب۔ و تمدن اسلامی۔

مسجد آمد کی توصیف میں رقمطراز ہے:

"اس کی وضو گاہ نہایت حسین وجمیل اور صنعت کاری کا بے مثال نمونہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی خوبصورت چیز دیکھنے میں نہیں آئی۔"

طرابلس الشام[1] کے ایک بازار کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

"بازار کے اندر پانی کی ایک بہت بڑی سبیل بنی ہوئی ہے جس میں پانچ ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ ان سے اس قدر کثرت سے پانی نکلتا ہے کہ تمام لوگ بخوبی اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔"

عصام الدین ابن دقماق نے مصر کے خاندانِ طولون کے ایک وزیر کے متعلق لکھا ہے کہ ۳۰۲ھ یا ۳۰۳ھ میں اس کے پاس صرف محکمہ بہم رسانی آب کی وزارت کا قلمدان تھا۔[2]

فسطاط[3] کی کھدائیوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مصر کا یہ سب سے پہلا اسلامی شہر بڑی افراط کے ساتھ صحت افزا ساز و سامان سے بہرہ مند تھا۔ ان کھدائیوں کے نگران مشہور ماہرین آثارِ قدیمہ مرحوم علی بک بہجت اور موسیو البیر جبریل نے اپنے اکتشافی آرٹیکل میں لکھا ہے:

"فسطاط میں صحت افزا اشیاء اس قدر عمومیت اور کثرت سے برآمد ہوئی ہیں کہ ان سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس شہر میں مسلمانوں نے پبلک ہیلتھ پر غیر معمولی اعتناء برتا ہے۔ ہمیں کھدائیوں میں ایسا کوئی گھر نہیں ملا ہے جس میں غسل خانوں اور بیت الخلا کی مسقف نالی نہ ہو۔ یہ نالی گھر کا تمام پانی جمع کر کے باہر حوضوں تک پہنچاتی ہے۔"[4]

---

[1] طرابلس الشام لبنان کا دوسرا بڑا شہر ہے، بندرگاہ ہے، عراق کی پٹرول پائپ لائن اسی شہر میں آکر ختم ہوتی ہے۔

[2] الانتصار بواسطہ عقد الاعصار ج ۴ ص ۶۔

[3] یہ مصر میں مسلمانوں کے سب سے پہلے آباد کردہ شہر کا نام ہے۔ اسے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص نے آباد کیا تھا۔ یہ قاہرہ اور قدیم مصر کے درمیان واقع ہے۔ آجکل اس کا نام ... ہے۔

[4] حفریات الفسطاط ص ۱۰۶۔

ان ماہرین نے اپنے آرٹیکل میں پوری تفصیل کے ساتھ اس شہر کے لیٹرین سسٹم، اور غسل خانوں کی نوعیت کو بیان کیا ہے۔ شہر میں بہم رسانی آب کے نظم و نسق پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے محفوظ کنوؤں، بچہ بچوں (FOUNTAIN) پائپ لائنوں، فواروں اور ہاتھ دھونے کے حوضوں کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ابتدائی ادوار میں بھی فنِ تعمیر اور انجینئرنگ کافی عروج پر تھا۔ اس ترقی کا راز دراصل مسلمانوں کا ذوقِ نفاست و طہارت تھا جو اسلام کے پاکیزہ نظام نے ان کی فطرت میں ودیعت کر رکھا تھا۔

مذکورۂ بالا ماہرینِ آثار نے اپنے مضمون میں بیروت کی فرانسیسی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ایک مخطوطے سے فسطاط کے محکمۂ احتساب کا ایک فرمان بھی نقل کیا ہے، یہ فرمان محکمہ کی جانب سے شہری عوام کے نام ہے۔ فرمان کا ملخص یہ ہے :

"از روئے قانون کسی کو جائز نہیں ہے کہ وہ راستوں اور گذرگاہوں پر ایسی چیزیں بنائے جو راہگیروں کے لیے موجبِ اذیت ہوں۔ یا انہیں نقصان پہنچنے کا احتمال ہو جیسے گرمیوں کے زمانے میں سڑکوں کی جانب گندی نالیوں کا رُخ کر دینا۔ اسی طرح جو لوگ شہر کے باہر کوڑا کرکٹ اور کھاد کے ڈھیر لگانا چاہیں انہیں لازم ہے کہ وہ باہر گڑھے کھودیں اور ان میں کوڑا کرکٹ ڈال کر اوپر سے پُر کر دیں تاکہ اُس کی بدبو سے کسی کو تکلیف نہ ہو اور بیماری کے جراثیم اُٹھنے پائیں۔ نہ دیئے جائیں نیز ایسے گڑھے پانی کے گھاٹوں کے آس پاس نہ کھودے جائیں اور نہ ہی کوڑا کرکٹ اور کھاد پانی کے نالابوں میں ڈالنے کی کوشش کی جائے[1]"۔

یہ ہم نے مشتے نمونہ از خروارے پیش کیا ہے، مدنہ تاریخ و آثار اور فقہاء کی کتابوں سے لاتعداد ایسی مثالیں دستیاب ہوتی ہیں جس سے اسلامی سوسائٹی کے اندر حفظانِ صحت کے اصول و قواعد کی مقبولیت اور پابندی کے ناقابلِ انکار ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔

تعمیرِ مکان میں ہمسائے کے حقوق کی پابندی | مکان کی تعمیر اور نقشہ بندی کے سلسلے میں شریعت نے

---

[1] حفریات الفسطاط ص ۱۰۶، ۱۱۱

مطلق العنان نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ چند اخلاقی حدود کا پابند کیا ہے جیسے ہم علامہ ابن حزم کے یہ الفاظ نقل کرکے آئے ہیں کہ مکان ایسا کھلا اور بے پردہ نہ ہو کہ گزرنے والوں کی نگاہیں اس کے اندر بلا روک ٹوک پڑتی رہیں۔ اسی طرح شریعت نے یہ پابندی بھی عائد کی ہے کہ مکان سے ہمسائے کو ضرر نہیں پہنچنا چاہیے۔ مکان کی اونچائی میں ہمسائے کی رضامندی کا دخل ضروری ہے۔ ایک بار صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایک پڑوسی کے دوسرے پڑوسی پر کیا حقوق ہیں۔ آپ نے ہمسائے کے حقوق گنوائے اور فرمایا: "ہمسایہ کا یہ بھی حق ہے کہ تم اپنی عمارت کو ہمسائے کی خوشنودی اور منشا کے بغیر اس کے مکان سے اونچا نہ لے جاؤ" شارع علیہ السلام کے اس ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ مکانات کی تعمیر اور نقشہ سازی میں اس امر کو بنیادی طور پر ملحوظ رکھا جائے کہ اس سے اردگرد کے مکانات کی پردہ دری ہونے کی نوبت نہ آنے پائے۔ یہ اہتمام مکان کے دروازوں اور دریچوں کے رخ متعین کرنے میں بھی کرنا ضروری ہے۔

انسانی صحت اور راحت کے بارے میں فقہ کا نظریہ موجودہ زمانے میں محکمہ صحت و صفائی کی اصطلاح میں جن مکانوں کو "مضر صحت" اور "مخل راحت" قرار دیا جاتا ہے، ان کے بارے میں اسلامی حکومت وہی سلوک اختیار کرتی ہے جو موجودہ بلدیاتی اداروں کے قواعد و ضوابط کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ موجودہ قواعد و ضوابط صرف تخریب سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اسلامی قواعد و ضوابط تخریب اور تعمیر دونوں پہلوؤں پر متوازی عمل درآمد کرتے ہیں یعنی شریعت اسلامی کی نگاہ میں شہری نظم و نسق کا کوئی ادارہ اگر کسی عمارت کو "مضر صحت" اور "آرام میں خلل انداز" ہونے والی قرار دیتا ہے تو اس کا فیصلہ صرف اس حد تک نہیں ہوتا کہ وہ اسے گرا دے یا اس میں کسی ترمیم و تبدیلی کے احکام جاری کر دے۔ بلکہ وہ ادارہ ایسے مکانات کے مالکان کو متبادل جگہ دینے کا ذمہ دار ہوگا اور انہیں نئے مکان میں آباد ہونے کے لیے مناسب امداد دینے کا کفیل ہوگا۔ اب ہم آپ کے سامنے فتاویٰ انقرویہ (مؤلفہ محمد بن حسین انقروی شیخ الاسلام ترکی) میں سے ایسے مکانوں کے بارے میں فقہ اسلامی کا رجحان معلوم کرنے کے لیے چند مثالیں نقل کرتے ہیں۔ ان مثالوں میں اگرچہ فقہاء کے

[illegible] فقہ [illegible] کی [illegible] جدید [illegible] ہے
ما بین اختلاف پایا جاتا ہے تاہم مجموعی طور پر اس سے حقوق انسانی کا تحفظ [illegible]

باغوں اور پارکوں میں (جنہیں قدیم اصطلاح میں حیاض کہا جاتا تھا اور اس وقت ان کی حیثیت مراکز صحت و تفریح کی ہوتی تھی) تنور لگانا، بیکری کھولنا، آٹا پیسنے کی چکی نصب کرنا، لوہا یا اور کوئی دھات کوٹنے کے اڈے قائم کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص ریشم کے کیڑے پالتا ہے اور ان سے ریشم حاصل کرنے کے لیے گھر میں مشین نصب کرتا ہے لیکن ارد گرد کے ہمسائے دھوئیں سے اور کیڑوں کی بُو سے تنگ ہیں تو اسے اپنے گھر میں اس کام سے روک دیا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں حمام جاری کر رکھا ہے اور اس کا دھواں ہمسایوں کے لیے وجہ مصیبت بن گیا ہے تو ہمسایوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اسے گھر میں حمام گری سے منع کر دیں۔ لوہار اور سنار اگر عشاء کے بعد طلوع فجر کے درمیانی عرصہ تک کوٹنے کا کام کرتے ہیں اور اس سے اہل محلہ کی نیند خراب ہوتی ہے تو انہیں قانوناً روکا جا سکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں باڑی لگا رکھی ہے، اور زمین شوریلی ہونے کی وجہ سے پانی کا اثر پڑوسیوں کے مکان کو گزند پہنچا رہا ہے (اور امکان ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو مکان کی بنیادیں ہل جائیں گی) تو اس شخص کو گھر باڑی سے منع کیا جائے گا۔ اسی طرح کوئی شخص پڑوسیوں کی ایذا رسانی اور تکلیف کی صورت میں اپنی دوکان کو اصطبل اور حمام نہیں بنا سکتا۔ اور نہ ہی کسی شخص کو یہ اجازت ہو گی کہ وہ کپڑے اور روئی کے بازار میں تنور یا آتشیں مادّے کی دوکان کھولے[1]

شروع شروع میں مسلمان بڑی بڑی عمارتیں بناتے اور ان پر مسرفانہ خرچ کرنے کو ناپسند خیال کرتے تھے لیکن بعد میں ضروریات کے تحت انہیں زمانے کے حالات کا ساتھ دینا پڑا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ نے بصرہ میں عتبہ بن مروان اور ان کے ساتھیوں کو ایک فرمان لکھا اور ان کو پختہ اینٹ سے عمارت

[1] کپڑے اور روئی کے بازار میں آتشیں مادّے کی دوکان کھولنے میں شریعت کی نگاہ میں جو قباحت پائی جاتی ہے اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے کراچی کے لیہری بازار کی آتش زدگی کا واقعہ سامنے رکھ لینا کافی ہے۔

تعمیر کرنے کی اجازت دیتے ہوئے ہدایت کی: پہلے میں تم لوگوں کے لیے اس طرح کی عمارتیں ناپسند کرتا تھا لیکن اگر تم ایسی عمارتیں بنانے پر اتر آئے ہو، تو یہ خیال رکھو کہ ان کی دیواریں چوڑی اور اونچی ہوں اور چھت کی لکڑیاں قریب قریب فاصلے پر ہوں[1]۔

گذرگاہوں اور راستوں کی حفاظت بذریعہ قانون | گذرگاہوں اور راستوں کی صفائی اور توسیع پر فقہ اسلامی خاص توجہ مبذول کرتی ہے۔ امام ابوالحسن ماوردی نے قاضی (مجسٹریٹ) کے اختیارات گنواتے ہوئے لکھا ہے کہ قاضی حکومت کے مصالح کا لحاظ رکھے، کسی شخص کو راستوں میں اور راستوں کے اردگرد کوئی عمارت وغیرہ نہ بنانے دے۔ بلا استحقاق نصب کیے ہوئے سائبان اور عمارات منہدم کرا دے۔ اس سلسلے میں قاضی بلا مطالبۂ مدعی بذاتِ خود اس کا انتظام کرے چونکہ یہ حقوق اللہ میں شامل ہے اس لیے اس میں مستغیث اور غیر مستغیث دونوں برابر ہیں۔ (لہٰذا قاضی خود ہی اس کا لحاظ رکھے)۔

راستے کی حفاظت کی خاطر علامہ ماوردی کی رائے یہ ہے کہ محکمۂ احتساب کے کارکنوں کے فرائض میں یہ بھی شامل کر دیا جائے کہ وہ لوگوں کو عام آمد و رفت کے راستوں پر عمارت بنانے کی ممانعت کر دیں۔ خواہ راستہ کشادہ ہی ہو۔ اور اگر کسی نے راستہ میں تکلیف دہ عمارت بنا ڈالی ہو تو چاہے وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو اسے مسمار کرا دیں۔ کیونکہ راستے نقل و حرکت میں آسانی کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ تعمیرات کے لیے[2]۔

شریعت اسلامی نے عام راستوں سے جمہور کے حقِ انتفاع کو پورے زور کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ فقہ کی رو سے راستہ کی زمین کو نہ فروخت کیا جا سکتا ہے نہ اسے مسدود کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو باہم تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ کسی کی شخصی ملکیت ہو اور اس کے بنانے سنوارنے پر کافی رقم خرچ کی گئی ہو[3]۔ دوکانوں کے چبوترے شارع عام کی جانب بڑھا دینا راہگیروں پر دست درازی اور تعدی

---

[1] البیان والتبیین للجاحظ ج ۲ ص ۱۸۶ [2] الاحکام السلطانیہ ص ۲۴۴

[3] منیۃ المفتی لیوسف بن ابی سعید سجستانی (مسائل الطرق والابواب ...)

کے مترادف ہے اس لیے محکمۂ احتساب کے ملازمین کا فرض ہے کہ ایسے چبوتروں کو فوراً مسمار کر دیں اور آئندہ کے لیے لوگوں کو اس قسم کی دست درازی سے سختی کے ساتھ منع کر دیں[1]۔ فتاویٰ القریہ میں ہے کہ کوئی شخص راستہ کے درمیان ایسا چھپتہ نہیں بنا سکتا جو راستہ کی سہولت میں خلل انداز ہوتا ہو۔ اور اگر عامۃ المسلمین میں سے کوئی شخص اٹھ کر چھپتہ بنانے والے کو روکتا ہے اور اس سے جھگڑا کرتا ہے تو یہ قانوناً جائز ہے بلکہ اُسے یہاں تک حق حاصل ہے کہ چھپتہ بنائے جانے کے بعد اُسے گرا دے۔ فتاویٰ القریہ کی یہ عبارت بھی قابلِ ذکر ہے کہ:

"تنگ راستوں میں جو شخص دوکان لگا کر بیٹھتا ہے اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتا ہے ایسے دوکاندار سے چیزیں خریدنا شرعاً ممنوع ہے۔ اس لیے کہ راستوں پر بلا عذر بیٹھنا مکروہ ہے پس اگر ایسے دوکاندار سے ٹھوکر کھا کر کوئی راہگیر گر جاتا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے تو وہ اس کی ہلاکت کا ضامن ہوگا۔ ایسے آدمی سے اشیاء خریدنے کا مطلب یہ ہوگا کہ معصیت کے کام پر اس کی حوصلہ افزائی اور اعانت کی جا رہی ہے۔"

اسلامی حکومت کا محکمۂ احتساب منجملہ دوسرے فرائض کے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیام کے بارے میں اس پر عائد ہوتے ہیں ایسے فرائض بھی انجام دینے کا ذمہ دار ہے جو آجکل میونسپلٹیاں اور بلدیاتی مجالس انجام دیتی ہیں۔ اس محکمہ کے کارکن پورے شہر میں گشت کرتے رہتے ہیں اور جہاں کہیں شہری قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی دیکھتے ہیں اُس کا وہیں موقع پر انسداد کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر محتسب دیواروں اور مکانوں کی چھتوں کے اندر ایسے پرنالے لگے ہوئے پاتے، جن سے گندے چھینٹے نکل کر راہگزروں کو ملوث کرتے رہتے ہوں تو اُسے چاہیے کہ وہ صاحب خانہ کو بذریعہ حکم مجبور کرے کہ وہ پرنالوں کو مسقف کرے اور یا انہیں دیوار کے اندر اس طرح سے کھود کر بنائے کہ ان کا پانی گلی میں غلاظت بارش تک [illegible] رہے۔

بازاروں اور گلیوں کی صفائی | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ | ماطۃ الاذی عن الطریق

[1] الشیرزی: کتاب نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبۃ ص ۱۱

صدقۃ (راستے سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا بھی صدقہ ہے) ایک دوسری روایت میں آتا ہے اسلام کی ستر سے اوپر شاخیں ہیں ان سب سے چھوٹی شاخ راستوں سے اذی کو زائل کرنا ہے۔ چنانچہ شارع علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص پھل دار درخت کے نیچے یا آمد و رفت کے راستہ پر یا نہر کے کنارے پر قضائے حاجت کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت برستی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بعد مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا تھا کہ وہ بلا تکلف ایک دوسرے کو راستوں کے اندر کوڑا کرکٹ پھینکنے یا بول و براز کرنے سے منع کرنے لگے۔ بستان العارفین کے مصنف مشہور فقیہ امام ابو اللیث سمر قندی نے یہاں تک لکھا ہے کہ "کسی صاحب عقل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ جہاں سے لوگ گزرتے ہوں، وہ وہاں تھوکے یا ناک صاف کرے۔ اور لوگوں کے پاؤں کو گندہ کرنے کا موجب بنے"[۲]

ناصر خسرو ایرانی سیاح نے طرابلس الشام کی سڑکوں اور بازاروں کی نظافت و نفاست سے متاثر ہو کر لکھا ہے کہ دیکھنے والے کو گمان ہوتا ہے کہ طرابلس الشام کا ہر بازار اور ہر منڈی سجایا ہوا محل ہے۔ ناصر خسرو جب طرابلس الشام سے فارغ ہو کر صیدا (لبنان کا ایک اور شہر) میں داخل ہوا تو وہاں کے بازاروں کو صاف و شفاف دیکھ کر اسے وہم ہوا کہ اس غیر معمولی زیب و زینت کا اہتمام یا تو بادشاہ کی آمد کی خاطر کیا گیا ہے یا کوئی خوشی کی تقریب ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس کا یہ وہم دور ہو گیا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ صفائی اس شہر کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے[۱]

ٹریفک کے اصول ٹریفک کے قواعد یہ ہیں کہ پیادہ راستے کے ایک جانب (فٹ پاتھ پر) چلے اور سوار راستے کے وسط میں۔ یہ پابندی شہر کے لیے ہے۔ اور اگر میدان یا صحرا ہو تو وسطِ شارع پیادہ کے لیے ہے اور دونوں کنارے سوار کے لیے۔ مستحب یہ ہے کہ پاپوش پہنے ہوئے شخص برہنہ پا کے لیے نرم اور صاف راستہ چھوڑ دے[۲]۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ عجائب الاسفار میں یہ اشارہ کیا ہے کہ دمشق کی گلیوں اور سڑکوں کے دو رویہ پٹریاں تھیں۔ پیدل چلنے والے پٹریوں پر چلتے تھے اور سوار

---

[۱] سفر نامہ ناصر خسرو۔

[۲] بستان العارفین للامام ابو اللیث سمر قندی ص ۱۲۱

دیکھتا رہتا ہے[1]

پبلک مقامات کی حیثیت شریعت اسلامی کی رو سے پبلک مقامات، مثلاً پل، سڑکیں، پارکیں، دروازے اور باغات کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کسی شہری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرلے اور دوسروں کو ان سے متمتع ہونے سے روکے۔ بلکہ یہ مقامات عوام منفعت کے لیے مشترک رہنے ضروری ہیں[2]۔

دریاؤں کے ساحل اور نہروں کے کناروں کے بارے میں متقدمین کا اجماع ہے کہ ان پر کسی قسم کی شخصی عمارت بنانا ممنوع ہے۔ اس سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ یہ صحت افزا اور تفریحی مقامات، امیر و غریب تمام شہریوں کے لیے مشترک رہیں۔ مؤرخ ابن ایاس (متوفی: ۱۵۲۴ء) نے تاریخ مصر "بدائع الزھور فی وقائع الدھور" میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جلال الدین سیوطی نے فتویٰ صادر کیا تھا کہ دریائے نیل کے اندر جزیرۃ الروضہ کے ساحل پر کسی قسم کی عمارت تعمیر کرنا ناجائز ہے اور امام شافعی کے مسلک میں اس کا جو جواز منقول ہے وہ غلط ہے۔ کتب شافعیہ میں اس کی صحت کا مطلقاً کوئی ثبوت نہیں ملتا[3]۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل نیل کے تمام سواحل عیش پرست امراء اور اغنیاء کی شخصی ملکیت بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کی وہ عمومی نفع رسانی جس سے تمام اہل شہر بہرہ ور تھے ان لوگوں کی اجارہ داری نے ختم کر دی ہے۔

دیہاتی آبادی میں بستیوں کے ارد گرد کی شاملات اراضی، چوپال، پڑاؤ اور مویشیاں لگانے کے مقامات (ابران) اسی حکم میں داخل ہیں جو شہری آبادی میں راستوں، باغوں اور پارکوں کا ہے۔ کیونکہ دیہاتی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے اور نفع رسانی میں ان کو وہی درجہ حاصل ہے جو شہر کے تفریحی مقامات کو حاصل ہے۔ اس لیے گاؤں کی مذکورہ زمینوں پر موات (غیر آباد) کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ یہ آبادی (عامر) کے تحت شمار ہوتی ہیں کیونکہ یہ آبادی کے رفاہ عامہ (مرافق) میں داخل ہیں[4]۔

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۶۰ ج ۱ [2] مرشد الحیران قدری پاشا، ص ۳

[3] بدائع الزھور ج ۱ ص ۱۷۱ [4] اللباب شرح مختصر القدوری ص ۲۰۲

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی طرزِ بود و باش

آخر میں ہم بحث کو سمیٹتے ہوئے مناسب سمجھتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے جس دور کا ذکر ہم نے پچھلے اوراق میں کیا ہے اور مسلم معاشرے کی عمرانی اور تمدنی حالات کے ایک پہلو کا جائزہ لیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی معلوم کریں کہ عین اس دور میں یورپ کی آبادیوں کا کیا حال تھا۔ ذیل میں ہم انگریز مؤرخ DRAPER کی کتاب معرکہ مذہب و سائنس کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں اس نے قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے شہروں کی حالت بیان کی ہے۔ ڈریپر لکھتا ہے:

"پورا براعظم تقریباً گھنے جنگلات میں گھرا ہوا تھا۔ گندے پانی کے جوہڑوں اور جھیلوں نے شہروں اور بستیوں کو گھیر رکھا تھا جن سے بدبو کے بادل اٹھ اٹھ کر اوپر کو چڑھتے تھے اور لوگوں کے لیے موت کا پیغام لے کر نازل ہوتے تھے۔ پیرس اور لندن میں لوگ لکڑی، گھاس کے سنے ہوئے گارے اور بانسوں سے مکان بناتے تھے۔ جن میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں ہوتا تھا۔

فرش فروش سے کوئی واقف نہ تھا۔ لوگ زمین پر گھاس پھوس بچھا کر گزارہ کرتے تھے۔ مکان کے اندر دھوئیں کی چمنی لگانا کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ دھواں مکان کی چھت میں سے ایک سوراخ کے اندر سے اوپر نکلتا تھا لیکن نکلنے سے پہلے مکان کے اندر پھیل کر رہنے والوں کو طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کر دیتا تھا۔ عوام صفائی اور نظافت کے نام سے بھی آشنا نہ تھے جانوروں کی اوجھ، کوڑے اور سبزیوں کے چھلکے گھروں کے سامنے پھینک دیتے تھے اور وہ ایک ڈھیر کی شکل میں بدبو اور تعفن کا سٹور بنے رہتے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے ایک ہی کوٹھری میں سوتے تھے۔ اور اکثر اوقات اسی کوٹھری میں گھر کے ڈھور ڈنگر بھی بندھے ہوتے تھے اس خانگی شور و غل اور پراگندگی میں شرم و حیا اور فضیلت کا پنپنا محال تھا۔"[1]

مؤلف حیات اجتماعی کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ بھی بتاتا ہے کہ آبادیوں میں پانی کے نالوں اور کھائیوں کا کوئی وجود نہ تھا۔ لوگ گندگی کی بالٹیاں اور پانی کے برتن گھر کے اندر کھڑے ہوئے باہر انڈیل دیتے تھے اور اکثر راہگیر ان کی لپیٹ میں آتے رہتے تھے۔ سڑکیں اور راستے بالعموم کیچڑ سے اٹے ہوئے اور تنگ و تاریک ہوتے تھے۔[2]

---

۱ LES COMFUTS DE SEIENCE ETDE IA

مغربی تحریکِ اصلاحِ مذہب کا اخلاقی پس منظر

عبد الحمید صدیقی

(یہ مضمون اگرچہ "عقلیت پرستوں کی خام خیالیاں" کی ہی دوسری کڑی ہے، لیکن اس کی حیثیت ایک الگ باب کی ہے۔ اس کا بیشتر حصّہ "عقلیت کے خلاف بغاوت" از آرنلڈ لون سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں فاضل مصنّف نے یہ بتایا ہے کہ تحریک اصلاحِ مذہب، جسے لوگ غلطی سے ایک عقلی تحریک سمجھتے ہیں، دراصل ایک جنسی تحریک تھی، جس کا منشا اصلاح و تجدید مذہب نہ تھا، بلکہ اُن اخلاقی قیود کو توڑنا تھا جو مسیحیت نے دنیائے مغرب پر عائد کر رکھی تھیں۔)

مغرب میں تحریک اصلاحِ مذہب (REFORMATION) کے موسس مارٹن لوتھر کے پرستار عام طور پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لوتھر نے رومن کیتھلک مذہب کو، جس کی بنیاد سراسر غیر عقلی عناصر پر تھی، منہدم کر کے اس کی جگہ ایک ایسے مذہب کی بنا ڈالی جو انسانی عقل کے عین مطابق اور "تفکّر و تدبّر" کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا۔ اس تحریک میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو غور و فکر کے خلاف پڑتی ہو یا جس سے انسان کی ذہنی پرواز کا راستہ مسدود ہوتا ہو۔ خواب و خیال کی دنیا میں بسنے والے لوگ یا عقل و خرد کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چلنے والے افراد جو چاہیں کہتے رہیں، لیکن وہ بالغ نظر حضرات جنہوں نے اس تحریک کا سطحی مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ گہرائی میں اُتر کر اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے، اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ مغرب کی تجدّد پسند تحریک عقلیت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود دراصل منفی بنیادوں پر قائم تھی اور اس کی بغاوت کا رُخ اتنا روایتی مذہب (رومن کیتھلک) کے خلاف نہیں تھا جتنا کہ خود عقل کے خلاف۔

یوں تو اسلام کے سوا دنیا کے سارے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی کمی نمایاں نظر آتی ہے جو وقتاً فوقتاً ان کی تجدید کر کے ان میں نئی رُوح اور اُن کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کرتیں اس لیے ان مذاہب کی تاریخ میں صدیوں ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جس میں ان کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا جو ان مذاہب کو تحریفات و بدعات سے پاک کر کے انہیں اپنی اصل شکل و صورت میں پیش کرتا۔ لیکن لوتھر کی تحریک اصلاحِ مذہب تو اس معاملہ میں سب سے ناکام کوشش ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے

کہ اس تحریک کا مقصود "تجدید یا احیائے مسیحیت" تھا ہی نہیں تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اگر لوتھر کا نصب العین واقعی اصلاحِ مذہب ہوتا تو وہ اس کو مادیت و نفس پرستی کے اس نرغہ سے، جس میں یہ مذہب اُس دور میں بدقسمتی سے گھرا ہوا تھا، نکالنے کی کوشش کرتا اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور مخلصانہ جدوجہد سے عیسائیت کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دیتا۔ لیکن مارٹن لوتھر اور اس کے معتقدین مادہ پرستی کے خلاف صف آرا ہونے کے بجائے خود اس کے کیمپوں میں جا گھسے اور عیسائیت کے [illegible] کر اُسکی پشت میں وہ خنجر پیوست کیا جو اس کے لیے بالکل جان لیوا ثابت ہوا۔ اس وار کے بعد پھر وہ ہمیشہ کے لیے ایک بے جان لاش بن کر رہ گئی۔ مسیحیت کی قبر پر بیٹھنے والے مجاور خواہ کتنی گہما گہمی اور ہماہمی کا مظاہرہ کریں لیکن ہر عقلمند انسان اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ عیسائیت ایک انقلاب انگیز تحریکِ فکر و عمل کی حیثیت سے اگرچہ لوتھر سے بہت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی، لیکن اس کے تابوت میں آخری میخ اس تحریکِ اصلاحِ مذہب کے ہاتھوں لگی اور اب اس کے پرستار اگر اس کی محبت کا دم بھرتے ہیں تو ان کی پوزیشن بالکل انہی لوگوں کی سی ہے جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند۔

تاریخِ مذاہب پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ کسی مذہب کو زندہ رکھنے کے لیے دو چیزیں ازحد ضروری ہیں۔ اولاً یہ کہ اُس کی تعلیمات میں کسی قسم کی تحریف و تبدیل نہ کی جائے، کیونکہ ایسا کرنے سے مذہب کی اصلی روح مٹ جاتی ہے اور پھر اُسے دوسرے مذاہب سے ممیز نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کا ہر مذہب اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے جو اُسے انفرادیت بخشتا ہے اور جس کی بنا پر اس کے پیروؤں کے اندر ایک الگ اندازِ فکر و عمل پیدا ہوتا ہے جو انہیں ایک الگ وحدت بنا دیتا ہے۔ اگر مذہب کی وہ امتیازی خصوصیات جن کے دم سے وہ زندہ ہے ختم کر دی جائیں تو پھر وہ خود بخود بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔

دوسری چیز جو بقائے مذہب کے لیے ضروری ہے وہ مذہب میں وقت کے تقاضوں اور حالات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ہے۔ چونکہ انسانی زندگی تغیر پذیر ہے اور اس میں تعطل اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔ اس لیے ہر عہد اپنے جلو میں کچھ نئے مسائل لے کر نمودار ہوتا ہے۔ یہ مسائل ہر مذہب، دین یا کسی نظامِ فکر و عمل کے لیے ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ مذاہب جو ان مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود بخود اپنی تحریکی روح کو زائل کر دیتے ہیں۔ تاریخِ انسانی اس بات کی شاہد ہے کہ ایسے تمام مذاہب جنہوں نے ان مسائل کے بارے میں فرار کی پالیسی اختیار کی، یا ان سے آنکھ مچولی کھیلنے میں عافیت سمجھی، وہ یا تو صفحۂ ہستی سے مٹ گئے یا

بالکل بے اثر اور بے وزن ہو کر رہ گئے۔ اسی طرح وہ مذاہب جن کے علمبرداروں نے وقت کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے بجائے خود اُن کے سامنے سپر ڈال دی اور اُن سے مغلوب ہو کر خود اپنے مذہب میں ردّو بدل شروع کر دیا، وہ بھی ان کی موت کا باعث بنے۔ ان کمزور لوگوں کی اعتدال پسندانہ توجیہات نے تحریفات کی شکل اختیار کرتے ہوئے ان مذاہب کی شکل وصورت کو مسخ کرکے رکھ دیا۔ ان کی حیثیت پھر دنیا میں ایک راہنما قوت کی سی نہ رہی بلکہ یہ وقت کے غالب رجحانات کے غلام بن کر رہ گئے۔

مارٹن لوتھر نے جس عہد میں جنم لیا، اُس میں عیسائیت پر تحریفات و تاویلات، بدعات، مشرکانہ اعمال ورسوم، ملحدیت اور نفس پرستی نے مسلسل حملے کرکے اسے بالکل مفلوج کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ خانقاہیں اور عبادت گاہیں نعیشات اور بداخلاقی کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ ورسب سے بڑھ کر یہ کہ مادہ پرستی اس کے مدِ مقابل کھڑے ہو کر اسے دعوت مبارزت دے رہی تھی۔ ان حالات میں اصلاح مذہب اور تجدید مسیحیت کی حقیقی خدمت یہ تھی کہ کوئی خدا کا بندہ تحریفات و تاویلات کا پردہ چاک کرکے حقیقی مذہب کے نقوش کو اجاگر کرتا، بدعات اور رومی اثرات کے خلاف آواز اٹھاتا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگا کر انہیں شکست فاش دیتا لیکن افسوس کہ لوتھر کی اصلاحی تحریک نے ان میں سے کوئی کام بھی نہ کیا بلکہ مادہ پرستی جو عیسائیت کی اصل حریف اور یورپ میں اس کی جانشین ہے، اس کے خلاف کوئی مؤثر اور وقیع دینی دعوت اور صدائے احتجاج بلند کرنے کے بجائے اُس کے سامنے بالکل ہتھیار ڈال دیئے۔

ان صفحات میں یہ ممکن نہیں کہ ہم ان امور پر کوئی تفصیلی بحث کر سکیں کہ کس طرح مارٹن لوتھر نے مسیحیت کو مادیت پرستی کے سامنے سرنگوں کیا۔ ہم یہاں اس شکست کے صرف اخلاقی پہلو کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہم میں سے کون اس بات سے ناواقف ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب کی بنیاد اخلاق پر قائم ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں ہم اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اخلاق مذہب کا بالکل منطقی اور فطری نتیجہ ہے۔ جو چیز عقیدہ کی شکل میں مذہب کہلاتی ہے وہی جب معرض عمل میں آتی ہے تو اخلاق نام پاتی ہے۔ اخلاق اس وقت تک موجود رہتا ہے جس وقت تک مذہب موجود ہے اور اگر اخلاق ختم کر دیئے

جائیں تو مذہب خود بخود مٹ جاتا ہے۔

پھر اس سلسلہ میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ مذہب جس اخلاق کی تعلیم دیتا ہے وہ اس اخلاق سے بالکل مختلف ہے جس کا مادیت پرستی پرچار کرتی ہے۔ مذہب جس اخلاق کا علمبردار ہے وہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہے، اس میں من و تو کے حجابات حائل نہیں ہوتے، اس میں اگرچہ انسان کے فطری داعیات کے لیے پوری گنجائش موجود ہوتی ہے، لیکن اس کی تعمیر میں حسیات سے بطور بنیاد کے کام نہیں لیا جاتا۔

اس کے برعکس مادیت جس اخلاق کو پیش کرتی ہے اس کا خمیر صرف حسیات سے اٹھایا جاتا ہے۔ یہ اخلاق انسان کو خواہشات کی غلامی اور نفس و جسد کی بندگی سے آزاد ہونے کا طریقہ نہیں سکھاتے، بلکہ ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ترغیب و تلقین کرتے ہیں۔ چونکہ حسی تمدن اور نظام میں علم کا ماخذ صرف حواس ہوتے ہیں، اس لیے انسان کے بارے میں یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک بولنے والا جانور ہے۔ اس بنا پر اس کے لیے جو ضابطۂ حیات تجویز کیا جاتا ہے وہ بھی روح اور مقاصد میں خالص حیوانی زندگی سے کچھ مختلف نہیں ہوتا۔ ایک حسی نظامِ حیات میں اخلاق کا لفظ تو بارہا سننے میں آتا ہے لیکن یہاں اس سے مراد ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جس سے انسان کو زیادہ سے زیادہ محسوس منفعت یا لذتِ نفس حاصل ہو۔

مذہبی اخلاق اور مادی اخلاق کی اس مختصر سی تشریح کے بعد یہ چیز بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مذہب میں اخلاق کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے حرص و ہوا، اس کی صنفی خواہشات، اس کے حسی میلانات کو اعلیٰ مقاصد کا پابند کر کے اسے حیوانی سطح سے اٹھا کر اشرف المخلوقات کے دائرہ میں داخل کیا جائے۔ برخلاف اس کے مادی اخلاق کا نصب العین یہ ہے کہ انسان پر سے ہر قسم کی قیود توڑ کر اسے بالکل آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی حیوانی جبلتوں کی جس طرح چاہے بے قید ہو کر تسکین کرے۔ اس اخلاق کی نگاہ میں معراجِ انسانیت یہ ہے کہ جسمانی اور حسی لذتوں کے حصول کے لیے اس پر کوئی پابندی باقی نہ رہے۔

البتہ یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے بار بار حسی اور حیوانی کے الفاظ استعمال کرنے سے آپ کو غلط فہمی نہ ہو کہ حسی تمدن جنگل کی ایک زندگی ہے، جس میں شہریت

اور شائستگی مفقود ہوتی ہے۔ درا صل ہم اسے اس کے ماخذ اور روح کے اعتبار سے حسّی کہہ رہے ہیں ورنہ شہری زندگی کے اعتبار سے یہ دنیا کا ترقی یافتہ تمدّن ہے اور اس میں بڑی رنگینیاں اور دلچسپیاں پائی جاتی ہیں۔ جب ہم اسے حسّی تمدن کا نام دیتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس میں اخلاق کا مقصود و مطلوب انسان کو حیوانی فطرت سے قریب تر کرنا ہے ــــ ایسی فطرت جو وجدان اور شہادتِ قلبیہ سے یکسر خالی ہو، جس میں صرف حِس، خواہش اور مطالباتِ نفس کی تکمیل کے سامان ہوں۔ باقی رہیں وہ چیزیں جو فطرتِ انسانی کے مقتضیات سے ہیں، جن کو انسان اپنے وجدان میں پاتا ہے، جن کے فوائد یا نقصانات مادّی اور حسّی نہیں بلکہ نفسی اور روحانی ہیں، ان کو یہ تمدّن سرے سے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ان تصریحات کے بعد اب دیکھیے کہ مارٹن لوتھر نے کس طرح اخلاق کے دائرہ میں مادیّت پرستی کو مسیحیت پر مسلط کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لوتھر کے زمانۂ عروج سے بہت پہلے مسیحیت پر سخت انحطاط طاری ہو چکا تھا۔ کلیساؤں سے کوئی زندگی بخش نعرہ بلند نہ ہوتا تھا بلکہ صرف تعطّل اور جمود کے درس دیے جاتے تھے راہبوں کے مسکن بدمعاشی اور عیّاشی کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے پادریوں پر مہیب اخلاقی جرائم کے الزامات عائد کیے جاتے تھے۔ سینٹ جیروم کا مقولہ ہے کہ اہلِ کلیسا کے تعیّش کے سامنے امراء اور دولتمندوں کی عیش و عشرت بھی شرماتی تھی۔ خود پوپ ہر قسم کی اخلاقی بیماری میں مبتلا تھے۔ اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق تو ان پر اتنا غالب تھا کہ منصب اور عہدے معمولی سامانِ تجارت کی طرح بکتے تھے اور کبھی کبھی ان کا نیلام ہوتا تھا۔ جنت کے قبالے، مغفرت کے پروانے، قانون شکنی کے اجازت نامے اور نجات کے سرٹیفکیٹ، جائداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح بے تکلّف فروخت ہوتے۔ مذہبی عہدیدار سخت راشی اور سود خوار تھے۔

یہ سب چیزیں اپنی جگہ صحیح اور درست سہی لیکن کیا یہ سب کچھ مسیحیت کی تعلیم کے عین مطابق ہو رہا تھا، یا یہ اُس کے خلاف تھا؟ کیا مسیحیت کا منشا اس قسم کی بدمعاشیوں، عیاشیوں اور فریب کاریوں کو فروغ دینا تھا یا اس کا مقصد ان کو مٹا کر دنیا میں نیکی، شرافت اور خدا ترسی کو پروان چڑھانا تھا؟ آج بائیبل کے تحریف شدہ نسخے جو ہمیں ملتے ہیں اُن کو بھی اگر سرسری طور پر ہی دیکھا جائے تو اس بات

کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے انسانیت کو نیکی کا پیغام دیا تھا، اُسے سچائی کو حاصل کرنے کی تلقین کی تھی، اُسے حسی خواہشات کو ضابطۂ اخلاق کا پابند بنانے کی ترغیب دی تھی۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عیسائیت نے دوسرے الہامی مذاہب کی طرح لوگوں کے سامنے سیرت و کردار کے بعض ایسے بلند اور اعلیٰ نمونے پیش کیے جو اپنی دلفریبیوں کی وجہ سے ہر قوم، ہر ملک، ہر زمانہ کو متاثر کرتے رہے ہیں، جو بہترین محرکِ اخلاق ہیں اور جن کی گرفت قلوبِ انسانی پر ہمیشہ مضبوط رہی ہے۔ یہ اسی اعلیٰ تعلیم کا اعجاز تھا کہ عیسائیت کے پیرو رومیوں جیسی مادہ پرست قوم کے درمیان رہ کر بھی اُس کی بدمعاشیوں اور عیاشیوں سے الگ، اُس کی سیاسی چالبازیوں سے دُور، اور اپنے گرد و پیش کی زہریلی ہوا سے غیر متاثر رہے۔ ان مسیحیوں نے مدتِ دراز تک اپنی اخلاقی آن بان قائم رکھی اور یہی درحقیقت عیسائیت کی کامیابی اور ارتقا کی واحد ضامن تھی۔ لیکن دیکھیے کہ لوتھر کی تحریکِ اصلاحِ مذہب نے کس طرح مسیحیت کے علمبرداروں کی روبہ انحطاط اخلاقی حالت کو مزید بگاڑ دیا۔ اگر لوتھر اپنے مشن میں مخلص تھا تو پھر اُس پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ ایک طرف اہلِ مذہب پر سے مردم آزار، آدم بیزار اور دشمنِ فطرت رہبانیت کے جنون کو اتار کر انہیں اس سے نجات دلاتا اور دوسری طرف مسیحیت کے علمبرداروں کو اخلاقی پستی اور گراوٹ کے مہیب غاروں میں سے نکال کر انہیں سیرت و کردار کے اعلیٰ مقام پر فائز کرتا۔ لیکن جب ہم لوتھر کی اصلاحی تحریک کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اُس نے فحاشی اور عیاشی کو روکنے کی بجائے اپنے طرزِ عمل سے اور تقویت بہم پہنچائی اور وہ تھوڑا سا "احساسِ زیاں" جو آزاد شہوت رانی کے راستے میں ایک حد تک رکاوٹ کا کام دے رہا تھا اسے ختم کر کے حسی فلسفۂ حیات کی توسیع و اشاعت کے لیے زمین ہموار کر دی۔

اب دیکھیے کہ یہ "تحریکِ اصلاحِ مذہب" کس طریق سے لوگوں کے اخلاق کو برباد کر کے انہیں اباحت مطلقہ کے راستے پر ڈالتی ہے۔

اس تحریک کے داعی کا یہ حال تھا کہ اُس نے اپنے حرم میں بے شمار خواتین بغیر نکاح کے ڈال رکھی تھیں اور جن کے بارے میں وہ بڑے فخر کے ساتھ ایک خط میں یوں لکھتا ہے:

"تم نکاح کے بارے میں میرے تاثرات دریافت کرنا چاہتے ہو، سو عرض ہے کہ تم میرے نکاح کے بارے میں قطعاً فکر مند نہ ہو۔ البتہ اگر تم میری پیروی کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر تمہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ تم اس کے متعلق مجھ سے سوال کرو۔ میری تین بیویاں تھیں[1] جن سے میں نے اتنی شدت سے محبت کی کہ اُن میں سے دو مجھے داغِ مفارقت دے گئیں اور اب وہ دوسرے آدمیوں سے عقدِ نکاح باندھنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔"

لوتھر نے اخلاقی پابندیوں کے خلاف اس قدر زور سے پراپگنڈا کیا کہ ملک میں ہر جگہ آزاد شہوت رانی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جن لوگوں نے اس شخص کی آواز پر لبیک کہا وہ ہر قسم کی اخلاقی قیود کو توڑتے ہوئے بالکل جانوروں کی طرح صنفِ نازک پر پل پڑے اور انہوں نے خانقاہوں میں جاکر وہاں عورتوں پر مجرمانہ حملے کیے۔ لوتھر اسی قسم کے ایک شخص کی "مقدس کارگزاری" کو مندرجہ ذیل الفاظ میں سراہتا ہے۔

"تم نے حضرت مسیح کی طرح اُن بے کس اور مجبور جانوں کو انسانی عذاب کے چنگل سے نجات دی ہے۔ تم نے یہ کام اُس وقت کیا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔"

اس قسم کی برائیوں کی ہمت افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریکِ اصلاحِ مذہب کے علمبردار خود آگے بڑھ بڑھ کر لوگوں کو بے حیائی کی دعوت دیتے رہے۔ ڈینفلی اپنی کتاب میں اسی گروہ کے ایک فرد کے ایک خط کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس خط میں یہ دیکھیے کہ کس جسارت سے حوا کی بیٹی کی خرید و فروخت کے انتظامات کیے جارہے ہیں۔

"نو راہب عورتیں ہمارے پاس ہیں، وہ خوبصورت ہیں اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اِن میں سے کوئی بھی پچاس برس کی نہیں، میرے بھائی! میں نے سب سے بڑی تمہارے لیے رکھی ہے اگر تم سب سے چھوٹی لینا چاہو جو سب سے حسین بھی ہے تو اس معاملہ میں بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

یہ صورتِ حال اس قدر افسوسناک اور وحشتناک تھی کہ اس سے نہ صرف ٹامس مور جیسے نیک اور

---

[1] واضح رہے کہ عیسائیوں کے ہاں ایک عورت سے زیادہ کے ساتھ کسی مرد کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ تمام بیویاں جناب لوتھر کے حرم میں بلا نکاح تھیں۔

پاکباز انسان کو بھی صدمہ ہوا بلکہ ڈیرک جارج میکنسی جیسے دنیا دار لوگ بھی گھبرا اٹھے اور انہوں نے اس طرزِ عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

لوتھر نے جو ضابطۂ اخلاق پیش کیا اُس کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تحریک اصلاح مذہب کس قسم کے اخلاق کی نشو ونما کر رہی تھی۔ لوتھر اپنے متبعین کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جب کبھی شیطان تمہارے دل میں بُرے وساوس پیدا کرے تو تم فوراً خلوت سے نکل کر جلوت میں آجاؤ، جی بھر کر شراب پیو، خوب ہنسی مذاق کرو۔ انسان کو کبھی کبھار دل کھول کر شراب پینی چاہیے، اُسے حماقتوں میں بڑھ چڑھ کر شریک ہونا چاہیے، اور شیطان سے نفرت کے اظہار کے لیے گناہ کرکے مسرور ہونا چاہیے تاکہ ضمیر کی خلش ہمیں کبھی بھی چھوٹے چھوٹے معاملات میں بے چین نہ کرنے پائے۔ اگر ہم گناہوں سے بچنے کے لیے شدت سے متمنی ہوں گے تو ہم حالات کے ہاتھوں شکست کھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر کبھی شیطان یہ کہے کہ "شراب مت پیو" تو میں اس چیلنج کے جواب میں زیادہ پیوں گا، زیادہ غیر محتاط اور فضول گفتگو کروں گا تاکہ میں شیطان پر خندہ زن ہو سکوں، جو کہ وقتاً فوقتاً مجھ پر پھبتیاں کستا رہتا ہے۔ اگر میں کوئی ایسا زبردست گناہ کر سکوں جس سے شیطان بھی شرمائے تو میں حقیقت میں پھر اپنے آپ کو کامیاب کہلانے کا مستحق ہوں۔ اس سے شیطان پر یہ راز منکشف ہو جائے گا کہ میں کسی چیز کو گناہ نہیں سمجھتا، مجھے کسی گناہ کا شعور ہی نہیں۔ ہم، جنہیں شیطان اس قدر ہراساں کرتا ہے، اس کے نرغہ سے اسی صورت میں باہر نکل سکتے ہیں، جب ہم ضمیر کی خلش کو اپنے دل و دماغ سے یکسر نکال دیں۔"

پچھلے صفحات میں ہم نے اس امر کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مذہب سے ہمیں جو اخلاق حاصل ہوتا ہے اُس کی اقدار معروضی ہوتی ہیں، یعنی وہ انسان کے احساس و جذبات، اُس کی خواہشات اور میلانات کا تابع نہیں ہوتا بلکہ ان کی حفاظت اور پاسبانی کرتا ہے، ان کے اندر اعتدال پیدا کرکے انہیں انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد بناتا ہے۔ لیکن مادیت پرستی جس اخلاق کی مبلغ

اور داعی ہے وہ حسّی لذات اور نفسانی خواہشات کے محور پر گھومتا ہے یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ حظِ نفس اس کا راہنما بن کر اس کی تشکیل و تربیت کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مذہب کا پیش کردہ ضابطۂ اخلاق معروضی ہونے کے ساتھ ساتھ خارجی بھی ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے مادی فلسفۂ اخلاق افراد اور زمان و مکان کے ساتھ ساتھ ہمیشہ متغیر رہتا ہے۔ انسان جو چاہیں کریں، اخلاق کا کام اسی قدر ہے کہ وہ اس کے ہر فعل کے لیے، خواہ وہ کتنا گھناؤنا ہو سندِ جواز عنایت کر دے۔ جب ہم اس زاویۂ نگاہ سے اس تحریک کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مادیت پرستی کی طرح لوتھر کی اصلاح مذہب کی تحریک بھی داخلیت کی متبع ہے۔ جس چیز کو ہم مذہب کی حقانیت کہتے ہیں، لوتھر کے مذہب میں وہ درحقیقت حسّی خواہشات اور جسمانی لذات کی بالادستی کا اعتراف و اقرار ہے۔ خود لوتھر نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

: خدا کی طرف سے تم پر اس کے سوا اور کوئی فرض عائد نہیں ہوتا کہ تم اُس کی ذات کے وجود کا اقرار کرو۔ دنیا کے باقی معاملات میں اس نے تمہیں آزادی دے رکھی ہے کہ تم ضمیر کی کسی ادنیٰ اخلش کے بغیر جس طرح چاہو کرتے رہو۔ وہ شخص جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اُس کے باپ نے اُس کے سارے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے، بالکل معصوم ہے ــــ اتنا معصوم جتنا کہ خود مسیح ہیں"۔

اس تحریکِ اصلاحِ مذہب نے اخلاق کا جس طرح دیوالہ نکالا، وہ خود لوتھر کے لیے بھی بالآخر موجبِ پریشانی ہوا۔ اس صنفی انارکی سے جھنجھلا کر وہ لکھتا ہے:

"اب جبکہ ایک شیطان کو ہم نے نکال دیا ہے تو سات اور شیاطین گھس آئے ہیں۔ آج کل انسان زیادہ حریص، زیادہ بے رحم، زیادہ شریر اور زیادہ ناعاقبت اندیش ہو گئے ہیں۔ نفرت، نفع اندوزی، زیردست آزاری، سفاکی، فحاشی، بدمعاشی اور فریب کاری اخلاق کے نوامیسِ عالیہ قرار دیئے گئے ہیں اور یہ حالت تو اس سے بدرجہا بدتر ہے جس میں کہ لوگ پادریوں کے زیرِ اثر زندگی گذار رہے تھے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ ہماری تعلیمات کے ہمیں یہ نتائج دیکھنے پڑیں گے"۔

اسی طرح اُس کے بڑے نامور نقاد کارنے بھی اپنے متبعین کی اخلاقی پستی کا دل کھول کر رونا رویا ہے۔

ہانی صلاۃ

رسائل و مسائل

نظامِ اسلامی میں نزاعی امور کے فیصلہ کا صحیح طریقہ

سوال: قرآن مجید میں ارشاد ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۔ (اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے)۔

اس آیت کی تفسیر میں آپ نے تفہیم القرآن میں فرمایا ہے: "وہ بات جو آیت زیرِ بحث میں مستقل اور قطعی اصول کے طور پر طے کر دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ پر بھی نزاع واقع ہو گی اس میں فیصلہ کے لیے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہو گا اس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کو سند اور مرجع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظامِ زندگی سے ممیز کرتی ہے۔"

آپ کی اس تشریح سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ سارے نزاعی امور میں آخری اور فیصلہ کن چیز اللہ اور اُس کے رسول کے احکام ہیں۔ اس ضمن میں ایک الجھن یہ پیش آتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تو یہ بالکل ممکن تھا کہ جس وقت کوئی اختلاف رائے

ہوتا اُسی وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کر لیا، لیکن اب جبکہ حضور ہمارے درمیان موجود نہیں بلکہ صرف اُن کی تعلیمات ہمارے سامنے ہیں، اس وقت اگر اسلام کے کسی حکم کی تعبیر کا مسئلہ درپیش ہو تو ایک اسلامی نظام میں کس شخص یا ادارہ کو اس امر کا فیصلہ کرنے کا آخری اختیار حاصل ہوگا کہ اس باب میں منشائے شریعت کیا ہے۔ امید ہے آپ اس معاملہ میں رہنمائی فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

جواب:- اس سوال میں جس الجھن کا ذکر کیا گیا ہے اس کو رفع کرنے میں قرآن، سنت، دورِ صحابہ کا تعامل، عقلِ عام، اور دنیا کا معروف طریقِ کار، سب مِل جُل کر ہماری مدد کرتے ہیں۔ سب سے پہلے قرآن کو دیکھیے۔ وہ اس معاملہ میں تین اصولی ہدایات دیتا ہے:-

اوّل یہ کہ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل الذکر سے پوچھ لو" (النحل رکوع ۶ - الانبیاء رکوع ۱)۔ اس آیت میں "اہل الذکر" کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ "ذکر" کا لفظ قرآن کی اصطلاح میں مخصوص طور پر اُس سبق کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے کسی امت کو دیا ہو، اور اہل الذکر صرف وہ لوگ ہیں جنہیں یہ سبق یاد ہو۔ اس لفظ سے محض علم (KNOWLEDGE) مراد نہیں لیا جاسکتا، بلکہ اس کا اطلاق لازماً علم کتاب و سنت ہی پر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ آیت فیصلہ کرتی ہے کہ معاشرے میں مرجعیت کا مقام اُن لوگوں کو حاصل ہونا چاہیے جو کتاب الٰہی کا علم رکھتے ہوں اور اُس طریقے سے باخبر ہوں جس پر چلنے کی تعلیم اللہ کے رسول نے دی ہے۔

دوم یہ کہ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْھُمْ "اور جب کبھی امن یا خوف سے تعلق رکھنے والا کوئی اہم معاملہ ان کو پیش آتا ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اس کو رسول تک اور اپنے اولی الامر تک پہنچاتے تو اس کی کنہ جان لیتے وہ لوگ جو ان کے درمیان اس کی کنہ نکال لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں" (النساء۔ رکوع ۱۱)۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاشرے کو پیش آنے

والے اہم معاملات میں، خواہ وہ امن کی حالت سے تعلق رکھتے ہوں یا جنگ کی حالت سے، غیر اندیشناک نوعیت کے ہوں یا اندیشناک نوعیت کے، ان میں صرف وہی لوگ مرجع ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اولی الامر ہوں، یعنی جن پر اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو اور جو "استنباط" کی صلاحیت رکھتے ہوں، یعنی پیش آمدہ معاملے کی حقیقت بھی معلوم کر سکتے ہوں اور کتاب اللہ و طریقِ رسول اللہ سے بھی دریافت کر سکتے ہوں کہ اس طرح کی صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیے۔ یہ آیت اجتماعی مہمات اور معاشرے کے لیے اہمیت رکھنے والے معاملات میں عام اہل الذکر کے بجائے ان لوگوں کو مرجع قرار دیتی ہے جو اولی الامر ہوں۔ لیکن بہر حال ان کو بھی ہونا چاہیے اہل الذکر ہی میں سے، کیونکہ وہی اس قابل ہو سکتے ہیں کہ جس قضیے سے ان کو سابقہ پڑا ہے اس میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی قولی و عملی ہدایات کو نگاہ میں رکھ کر صحیح رائے قائم کر سکیں۔

سوم یہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ "ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔" (الشوریٰ رکوع ۴)۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا آخری فیصلہ کس طرح ہونا چاہیے۔

ان تین اصولوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو تمام نزاعات میں فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا منشا پورا کرنے کی عملی صورت یہ سامنے آتی ہے کہ لوگوں کو اپنی زندگی میں عموماً جو مسائل پیش آئیں ان میں وہ "اہل الذکر" سے رجوع کریں اور وہ انہیں بتائیں کہ ان معاملات میں خدا اور رسول کا حکم کیا ہے۔ رہے مملکت اور معاشرے کے لیے اہمیت رکھنے والے مسائل، تو وہ اولی الامر کے سامنے لائے جائیں اور وہ باہمی مشاورت سے یہ تحقیق کرنے کی کوشش کریں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی رو سے کیا چیز زیادہ سے زیادہ قرینِ حق و صواب ہے۔

اب دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں، اور حضور کے بعد خلافتِ راشدہ کے دور میں عملدرآمد کیا تھا۔ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں جو معاملات براہِ راست آپ تک پہنچتے تھے۔ ان میں تو اللہ اور رسول کا منشا بتانے والے، اور اس کے مطابق نزاعات کا فیصلہ کرنے والے آپ خود تھے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ پوری مملکتِ اسلامیہ میں پھیلی ہوئی آبادی کو جو معاملات پیش

آتے تھے وہ سب کے سب براہِ راست حضور ہی تک نہیں پہنچائے جاتے تھے اور نہ آپ ہی سے شخصاً ان کا فیصلہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کے بجائے مملکت کے مختلف علاقوں میں آپ کی طرف سے معلّمین مامور تھے جو لوگوں کو دین سکھاتے تھے اور عام لوگ اپنے روزمرّہ کے معاملات میں انہی سے معلوم کرتے تھے کہ کتاب اللہ کا حکم کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طریقے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقے میں امیر، عامل، اور قاضی مقرر تھے جو اپنے اپنے دائرۂ عمل سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر معاملات کے خود فیصلے کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ کا منشا پورا کرنے کا جو طریقہ حضور نے خود پسند فرمایا تھا وہ حضرت مُعاذ بن جَبَل کی مشہور حدیث میں بیان ہوا ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذاً الی الیمن فقال کیف تقضی قال اقضی بما فی کتاب اللہ، قال فان لم یکن فی کتاب اللہ قال فبسنۃ رسول اللہ، قال فان لم یکن فی سنۃ رسول اللہ، قال اجتہد رائی، قال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ۔ (ترمذی، ابواب الاحکام۔ ابوداؤد، کتاب الاقضیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کی طرف قاضی بنا کر روانہ کیا تو ان سے پوچھا تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا اُس ہدایت کے مطابق جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ملے۔ عرض کیا پھر جو سنت رسول اللہ میں ہو۔ فرمایا اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے عرض کیا میں اپنی رائے سے (حق و صواب تک پہنچنے کی) پوری کوشش کروں گا۔ اس پر حضور نے فرمایا شکر ہے اس خدا کا جس نے رسول اللہ کے فرستادہ شخص کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔

حضور نے اپنے عہدِ مبارک میں شوریٰ کے نظام کی بنا بھی ڈال دی تھی اور ہر ایسے معاملے میں جس کے متعلق آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص حکم نہ ملا ہو، آپ معاشرے کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال وہ مشاورت ہے جو آنحضور نے اس مسئلے پر

فرمائی تھی کہ لوگوں کو نماز کے اوقات پر جمع کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے، اور جس کے نتیجے میں بالآخر اذان کا طریقہ آپ نے مقرر فرمایا۔

قریب قریب یہی طریق کار عہدِ رسالت کے بعد خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عہدِ رسالت میں حضور خود موجود تھے اس لیے معاملات کا آخری فیصلہ آپ سے شخصاً حاصل کیا جا سکتا تھا، اور بعد کے دور میں مرجع آپ کی ذات نہ رہی بلکہ وہ روایات ہو گئیں جو آپ کی سنت کے متعلق لوگوں کے پاس محفوظ تھیں۔ اس دور میں تین ادارے الگ الگ پائے جاتے تھے جو اپنے اپنے مقام و موقف کے لحاظ سے فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ کا منشا پورا کرتے تھے۔

(۱) عام اہلِ علم جو کتاب اللہ کو جانتے تھے اور جن کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں یا حضور کے طریقِ عمل یا حضور کی تقریر[۱] کے بارے میں کوئی علم موجود تھا۔ ان سے صرف عوام الناس ہی اپنی زندگی کے معاملات میں فتوے نہیں لیتے تھے بلکہ خود خلفائے راشدین کو بھی جب کسی مسئلے کا فیصلہ کرنے میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی کہ حضور نے اس کے بارے میں کوئی حکم دیا ہے یا نہیں، تو انہی لوگوں کی طرف رجوع فرمایا کرتے تھے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ خلیفۂ وقت نے علم نہ ہونے کی وجہ سے ایک مسئلے کا فیصلہ اپنی رائے سے کر دیا ہے اور بعد میں جب معلوم ہوا ہے کہ اس معاملہ میں کوئی دوسری بات حضور سے ثابت ہے تو اس فیصلے کو بدل دیا ہے۔ ان اہلِ علم کی موجودگی کا فائدہ صرف یہی نہ تھا کہ فرداً فرداً وہ عوام اور اولی الامر کے لیے ایک ذریعۂ علم کا کام دیتے تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر ان کا عظیم تر فائدہ یہ تھا کہ مجموعی طور پر وہ اس بات کی ضمانت تھے کہ کوئی عدالت اور کوئی حکومت اور کوئی مجلسِ شوریٰ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کی مضبوط رائے عام نظام اسلامی کی پشت پناہ تھی۔ ہر غلط فیصلے کو ٹوکنے کے لیے ان کا چوکنا رہنا نظام کے صحیح چلنے کا ضامن تھا۔ کسی مسئلے میں ان کا اتفاق رائے اس بات

---

[۱] تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضور کے زمانے میں کوئی عمل کیا گیا ہو اور آپ نے اس کو برقرار رہنے دیا ہو۔

کی دلیل تھا کہ اس مسئلہ خاص میں دین کی راہ متعین ہے جس سے ہٹ کر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، اور ان کا اختلاف رائے یہ معنی رکھتا تھا کہ اس مسئلے میں دو یا زیادہ اقوال کی گنجائش ہے اگرچہ فیصلہ ایک ہی قول پر ہو چکا ہو۔ ان کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا کہ امت کے اندر کوئی بدعت قبولِ عام حاصل کرنے پائے، کیونکہ ہر طرف دین کے جاننے والے لوگ اس پر گرفت کرنے کے لیے موجود تھے۔

(۲) قضاء، یعنی عدلیہ جس کے ضابطے کی وضاحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کے نام اپنے ایک فرمان میں اس طرح کی ہے:

اقض بما فی کتاب اللہ، فان لم یکن فی کتاب اللہ فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فان لم یکن فی کتاب اللہ ولا فی سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاقض بما قضی بہ الصالحون فان لم یکن فی کتاب اللہ ولا فی سنۃ رسول اللہ ولم یقض بہ الصالحون فان شئت فتقدم وان شئت فتأخر ولا اری التأخر الا خیرا لک والسلام علیکم (النسائی، کتاب آداب القضاۃ)	فیصلہ اس حکم پر کرو جو کتاب اللہ میں ہو، اگر کتاب اللہ میں نہ ہو تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، اگر نہ کتاب اللہ میں ہو نہ سنت رسول اللہ میں تو پھر صالحین نے جو فیصلے کیے ہوں ان کے مطابق فیصلہ کرو۔ لیکن اگر کسی معاملے کا حکم نہ کتاب اللہ میں ملتا ہو نہ سنت رسول اللہ میں، اور نہ صالحین ہی کے فیصلوں میں اس کے متعلق کوئی نظیر موجود ہو تو تمہیں اختیار ہے چاہے خود پیش قدمی کرو یا رک جاؤ، اور میرے نزدیک رک جانا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے[1]

اسی ضابطے کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قد اتی علینا زمان ولسنا نقضی و	وہ زمانہ گزر چکا ہے جب ہم نہ فیصلہ کرتے تھے اور نہ

---

[1] رک جانے سے دو چیزیں مراد ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ قاضی کچھ دیر اس بات کا انتظار کرے کہ کوئی دوسری عدالت پیش قدمی کر کے اس طرح کے ایک معاملے میں نظیر قائم کرتی ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ قاضی خود فیصلہ کرنے کے بجائے اس معاملہ میں اُس تیسرے ادارے کی طرف رجوع کرے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

لسنا هنالك ثم ان الله عزوجل قدر
علينا ان بلغنا ما ترون فمن عرض له
منكم قضاء بعد اليوم فليقض بما في
كتاب الله فان جاء امر ليس في كتاب الله
فليقض بما قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم
فان جاء امر ليس في كتاب الله ولا قضى
به نبيه صلى الله عليه وسلم فليقض
بما قضى به الصالحون فان جاء امر ليس
في كتاب الله ولا قضى به نبيه صلى الله عليه
وسلم ولا قضى به الصالحون فليجتهد
رأيه ولا يقول اني اخاف واني اخاف
فان الحلال بين والحرام بين وبين ذالك
امور مشتبهات فدع ما يريبك الى
ما لا يريبك۔

(النسائی، کتاب مذکور)

ہماری یہ حیثیت تھی کہ فیصلے کریں (یعنی سرکار رسالتمآب
کا دور)۔ اب تقدیر الٰہی سے ہم اس حالت کو پہنچے ہیں
جو تم لوگ دیکھ رہے ہو۔ پس اب تم میں سے جس کے
سامنے کوئی معاملہ فیصلے کے لیے پیش ہو تو اسے چاہیے
کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور اگر ایسا کوئی
معاملہ آجائے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو اس کا
فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے مطابق کرے
اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کا حکم نہ کتاب اللہ میں
ہو اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا
ہو تو صالحین نے اس کا جو فیصلہ کیا ہو اس کی پیروی
کرے۔ لیکن اگر ایک معاملہ ایسا آجائے جو نہ کتاب اللہ
میں ہو، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں، اور
نہ صالحین نے اس سے پہلے کبھی اس کا فیصلہ کیا ہو
تو اپنی رائے سے راستی و صواب تک پہنچنے کی پوری
کوشش کرے اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں، میں ڈرتا
ہوں۔ کیونکہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح
اور ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں، سو مشتبہ امور میں آدمی کو وہ فیصلہ کرنا چاہیے جو اس کے ضمیر کو نہ
کھٹکے اور ایسا فیصلہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے جس کے متعلق خود اس کے ضمیر میں کھٹک ہو۔

یہ عدلیہ صرف عوام ہی کے باہمی نزاعات کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہ تھی بلکہ انتظامیہ (
کے خلاف بھی وہ لوگوں کے دعاوی سنتی اور ان کے فیصلے کرتی تھی۔ اس کے سامنے حاضر ہونے سے نہ کوئی
گورنر مستثنیٰ تھا نہ خود خلیفۂ وقت۔ اسی طرح انتظامیہ کے بڑے سے بڑے شخص، حتیٰ کہ خلیفۂ وقت کو

بھی، اور خود حکومت کو بھی اگر کسی کے خلاف کوئی ذاتی یا سرکاری دعویٰ ہوتا تھا تو اسے عدالت میں جانا ہوتا تھا اور عدالت ہی یہ طے کرتی تھی کہ خدا اور رسول کے قانون کی رو سے اس کا صحیح فیصلہ کیا ہے۔

(۳) اولی الامر یعنی خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ۔ یہ وہ آخری با اختیار ادارہ تھا جو قرآن کی ہدایت کے مطابق باہمی مشورے سے یہ طے کرتا تھا کہ معاشرے اور مملکت کو پیش آنے والے مختلف معاملات میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے کیا حکم ثابت ہے، اور اگر کسی معاملے کا حکم کتاب و سنت میں نہیں ہے تو اس کے بارے میں کونسا طرزِ عمل دین کے اصول اور اس کی روح اور جماعت مسلمین کی مصلحت کے لحاظ سے أقرب الی الصواب ہے۔ اس ادارے کے بکثرت فیصلے احادیث و آثار اور فقہ کی کتابوں میں مستند ذرائع سے نقل ہوئے ہیں، اور اکثر و بیشتر کے ساتھ وہ تفصیلی بحثیں بھی منقول ہوئی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت صحابہ کی مجلس میں ہوتی تھیں۔ ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ پوری سختی کے ساتھ جس قاعدۂ کلیہ کی پابندی کرتا تھا وہ یہ تھا کہ ہر معاملے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کیا جائے، پھر یہ معلوم کیا جائے کہ اگر اس طرح کا کوئی معاملہ حضور کے زمانے میں پیش آیا ہے تو آپ نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا ہے، اور اپنی صوابدید پر صرف اس صورت میں فیصلہ کیا جائے جب کہ یہ دونوں مآخذ ہدایت خاموش ہوں۔ جس معاملے میں بھی اللہ کی کتاب سے کوئی آیت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے کوئی نظیر ان کو مل گئی ہے، اس میں کبھی انہوں نے اس سے ہٹ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ پورے دورِ صحابہ میں اس قاعدے کے خلاف ایک مثال بھی ہم کو نہیں ملتی۔ اگرچہ عملاً مملکت میں آخری فیصلے کے اختیارات اولی الامر ہی کو حاصل تھے، لیکن قانوناً وہ قرآن اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری فیصلہ کن سند تسلیم کرتے تھے۔ اور مسلم معاشرہ بھی ان کے اقتدار کی اطاعت اسی اطمینان و اعتماد کی بنا پر کرتا تھا کہ وہ اپنے فیصلوں میں قرآن و سنت کی پیروی سے تجاوز نہ کریں گے۔ ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ وہم و گمان تک نہ تھا کہ وہ نصِ قرآن کے خلاف کوئی قانون بنانے یا حکم دینے کے مجاز ہیں۔ اسی طرح کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی اس تصور نے کبھی راہ نہیں پائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے صاحبِ امر تھے اور ہم اپنے زمانے

کہ صاحب امر تھا، ہم اس کے پابند نہیں ہیں کہ حضورؐ نے اپنے دورِ حکومت میں جو احکام دیئے ہوں ان کے نظائر کی پیروی کریں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد خلافت کا ادارہ جس روز وجود میں آیا اسی روز خلیفہ اوّل نے اپنے خطبے میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ

اطیعونی ما اطعت اللہ و رسولہ فان عصیت اللہ و رسولہ فلا طاعۃ لی علیکم	میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میرے لئے کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔

اس اعلان سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ خلافت کا یہ ادارہ قائم ہی اس معاہدے پر ہوا تھا کہ خلیفہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کریگا اور امت خلیفہ کی اطاعت کرے گی۔ دوسرے الفاظ میں امت پر خلیفہ کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کرے گا۔ اس شرط کے فوت ہوتے ہی امت پر سے خلیفہ کی اطاعت کا فریضہ آپ سے آپ ساقط ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد ذرا عقلِ عام سے کام لے کر دیکھیے کہ قرآن مجید کی آیت زیرِ بحث کا منشا کیا ہے اور اس کے تقاضے عملاً کس طرح پورے ہو سکتے ہیں۔ یہ آیت پورے مسلم معاشرے کو خطاب کر کے اسے علی الترتیب تین اطاعتوں کا ملتزم قرار دیتی ہے۔ پہلے خدا کی، پھر رسول کی، پھر ان اولی الامر کی جو خود اس معاشرے میں سے ہوں۔ اور نزاعات کے بارے میں ہدایت کرتی ہے کہ فیصلے کے لئے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس سے آیت کا جو منشا ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے پر اصل اطاعت خدا اور رسول کی واجب ہے، اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کے تابع ہے، نزاع صرف عوام کے درمیان ہی نہیں عوام اور اولی الامر کے درمیان بھی ہو سکتی ہے اور نزاع کی تمام صورتوں میں آخری فیصلہ کن اقتدار اولی الامر کا نہیں بلکہ خدا اور رسول کا ہے؛ ان کا جو حکم بھی ہو اس کے آگے عوام کو بھی سر جھکا دینا چاہیے اور اولی الامر کو بھی۔

اب پہلا سوال یہ ہے کہ فیصلہ کے لیے خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا خود سامنے موجود ہو اور اس کے حضور مقدمہ پیش کر کے فیصلہ حاصل کیا جائے، بلکہ اس سے مراد خدا کی کتاب سے یہ معلوم کرنا ہے کہ معاملہ متنازع فیہ میں اس کا حکم کیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ذاتِ رسولؐ سے براہِ راست رجوع کیا جائے، بلکہ لامحالہ اس کا مطلب بھی یہی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات اور آپ کے قول و عمل سے ہدایت حاصل کی جائے۔ یہ بات تو خود حضورؐ کی زندگی میں بھی ممکن نہ تھی کہ عدن سے لے کر تبوک تک، اور بحرین سے لے کر جدے تک ساری مملکت اسلامیہ کا ہر باشندہ اپنے ہر معاملے کا فیصلہ براہ راست حضورؐ ہی سے کراتا ہو۔ اس زمانے میں بھی سنت رسولؐ ہی کو احکام کا ماخذ ہونا چاہیے تھا۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ نزاعات میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت سے فیصلہ حاصل کرنے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ فیصلہ انسان ہی دینگے، کتاب اور سنت خود تو نہیں بولیں گے۔ لیکن لامحالہ یہ انسان وہی ہونے چاہئیں جن کے پاس کتاب و سنت کا قابلِ اعتماد علم ہو۔ اور کتاب و سنت کی بنیاد پر فیصلہ کرنے والے بہر حال نزاع کے فریقین خود نہیں ہو سکتے، ان کے سوا کوئی تیسرا غیر جانب دار شخص یا ادارہ ایسا ہونا چاہیے جو ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اب یہ بات نزاعات کی نوعیت پر منحصر ہے کہ کس قسم کی نزاع میں فیصلہ دینے کے لیے کون موزوں ہو سکتا ہے۔ ایک قسم کی نزاع ایسی ہے جس کا فیصلہ ہر ذی علم آدمی کر سکتا ہے۔ دوسری قسم کی نزاع لازماً ایک عدالت چاہتی ہے۔ اور بعض نزاعات اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ ان کا حتمی فیصلہ اولی الامر کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مگر ان سب صورتوں میں فیصلے کا ماخذ کتاب و سنت ہی کو ہونا چاہیے۔

یہ وہ بات ہے جو عقلِ عام کی مدد سے آیت کے الفاظ پر غور کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ اس کے ذہن میں کوئی اینچ پینچ نہ ہو۔ اب ایک نظر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ دنیا کا معروف طریقہ اس

آیت کے تجویز کردہ نظام اور اس کی عملی صورت کے سمجھنے میں ہماری کیا مدد کرتا ہے۔ دنیا میں آج قانون کی حکومت (RULE OF LAW) کا بڑا چرچا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انصاف کے قیام کے لیے قانون کی بالاتری ناگزیر ہے جس کے آگے بڑے اور چھوٹے سب یکساں ہوں اور جسے عامی اور حاکم اور خود حکومت پر بے لاگ طریقے سے نافذ کیا جائے۔ اس قانون کو چاہے ایک پارلیمنٹ ہی بنائے، مگر جب وہ قانون بن جائے تو جب تک وہ قانون ہے خود پارلیمنٹ کو بھی اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس حاکمیتِ قانون کے نظریے کو جہاں بھی عملی جامہ پہنایا گیا ہے وہاں لازماً چار چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے:

ایک، ایسا معاشرہ جو قانون کا احترام کرنے والا ہو اور اس کی پیروی کا حقیقی ارادہ رکھتا ہو۔

دوسرے، معاشرے میں بکثرت ایسے لوگوں کا پایا جانا جو قانون کو جانتے ہوں، لوگوں کو قانون کی پیروی میں مدد دے سکتے ہوں، اور جن کا مجموعی علم اور رسوخ و اثر اس بات کا ضامن ہو کہ نہ معاشرہ قانون کی راہ سے ہٹ سکے اور نہ سیاسی اقتدار کو اس سے ہٹنے کی جرأت ہو سکے۔

تیسرے، ایک بے لاگ عدلیہ جو عوام اور حکام اور حکومت کی باہمی نزاعات میں قانون کے مطابق ٹھیک ٹھیک فیصلے کرے۔

چوتھے ایک بلند ترین اختیارات رکھنے والا ادارہ جو معاشرے کو پیش آنے والے تمام مسائل و معاملات کا آخری حل تجویز کرے اور وہی حل معاشرے میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہو۔

ان حقائق کو نگاہ میں رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کی زیرِ بحث آیت دراصل اسلامی معاشرے میں قانون کی فرمانروائی ہی قائم کرتی ہے، اور اس پر عملدرآمد کے لیے وہی چار چیزیں درکار ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ وہ جس قانون کی فرمانروائی قائم کرتی ہے وہ فی الواقع اس کا مستحق ہے، اور دنیا میں جن قوانین کی بالاتری قائم کی جاتی ہے وہ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ وہ خدا اور رسول کے قانون کو بالاتر قانون قرار دیتی ہے جس کے آگے سب کو سر تسلیم خم کر دینا چاہیے اور جس کے تابع ہونے میں سب یکساں ہوں۔ اس کا مخاطب ایک ایسا

معاشرہ ہے جو اس قانون پر ایمان لائے اور اپنے قلب و ضمیر کے تقاضے سے اس کی اطاعت کرے۔ اس کا منشا پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں اہل الذکر کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی ہو جن کی مدد سے افراد معاشرہ اپنی زندگی کے معاملات میں ہر جگہ ہر وقت اس بالاتر قانون کی رہنمائی حاصل کرتے رہیں اور جن کے ذریعہ سے رائے عام اس نظام کی حفاظت کے لیے ہمیشہ بیدار رہے۔ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک نظام عدالت موجود ہو جو عوام ہی کے درمیان نہیں بلکہ عوام اور ان کے حاکموں کے درمیان بھی بالاتر قانون کے مطابق فیصلے کرے۔ اور وہ اولی الامر کے ایک ایسے ادارے کی طالب بھی ہے جو خود اس بالاتر قانون کا تابع ہو اور معاشرے کی اجتماعی ضروریات کے لیے اس کی تفسیر و تعبیر اور اس کے تحت اجتہاد کے آخری اختیارات استعمال کرے۔

قطبین میں روزہ کے اوقات کا تعین

سوال۔ قطبین کے علاقوں میں شب و روز کے پیمانے بالکل بدل جاتے ہیں۔ وہاں اگر چھ مہینے دن رہتا ہے تو چھ مہینے رات رہتی ہے۔ ایسے علاقوں میں روزہ کے لیے افطار اور سحری کے اوقات کا تعین کس طرح کیا جائے گا۔ کیا ہر شخص کی اپنی ہمت اور صوابدید پر یہ بات چھوڑ دی جائے گی کہ وہ جتنا طویل روزہ رکھ سکے رکھ لے کہ احکام الٰہی کی تعمیل میں جتنی سعی کی جائے اتنا ہی زیادہ اس کا اجر ہے، یا یہ بہتر ہو گا کہ گھڑی کے لحاظ سے ساری دنیا کے لیے روزہ کے یکساں اوقات مقرر کر دیئے جائیں۔ مثلاً سحری کھا کر سات بجے سے روزہ شروع ہو اور شام سات بجے افطار کر لیا؟

جواب :۔ روزہ کے سلسلہ میں ایک بات بالکل واضح ہے کہ صبح صادق کے طلوع سے روزہ شروع ہوتا ہے اور سورج غروب ہونے تک رہتا ہے۔ سرزمین عرب میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ۲۱ جون سب سے طویل دن ہوتا ہے اور اس دن سورج ساڑھے چار بجے طلوع ہو کر شام کو سات بجے غروب ہوتا ہے۔ سحری کا وقت اس روز صبح تین بجے تک رہتا ہے۔

اب اگر ساری دنیا کے لیے سحر و افطار کا یکساں ضابطہ مقرر کیا جائے اور ہر موسم اور ہر ملک میں صبح سات بجے سے شروع ہو کر شام کو سات بجے ختم ہو تو اس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہوں گے کہ شریعت کے اس قاعدے کو کہ اوقاتِ سحر و افطار سورج کے طلوع و غروب سے متعلق ہوں، بدل کر سحر و افطار کو گھڑی کی سوئی کا پابند بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ جرأت تو وہی شخص کر سکتا ہے جو خدا اور رسول کی جگہ خود شارع بن بیٹھے۔

البتہ یہ ایک واقعی اشکال ہے کہ خطِ استوا سے جوں جوں قطبین کی جانب بڑھتے جائیں شب و روز کا تفاوت بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جاڑوں میں دن چھوٹے اور راتیں بڑی ہوتی ہیں اور گرمیوں میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ اگر خطِ استوا کے شمالی منطقوں میں سردی کا موسم ہوتا ہے تو انہی دنوں میں خطِ استوا کے جنوبی علاقوں میں گرمیاں ہوتی ہیں۔ ۴۵ درجے عرض بلد تک تو یہ تفاوت قابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن اس سے آگے نہیں۔ قطبین ۹۰ درجہ عرض بلد پر واقع ہیں اور یہاں چھ مہینے سورج غروب نہیں ہوتا (سوائے ایک دن کے)، گویا قطبین پر سال میں صرف تین دن ہوتے ہیں جن میں دو دن ۲۴ ۲۴ گھنٹے کے اور ایک دن ہمارے ۳۶۳ دنوں کے برابر ہوتا ہے۔ ۷۰ درجہ عرض البلد پر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ۱۷ نومبر سے ۲۴ جنوری تک مسلسل رات رہتی ہے۔ ۲۵ جنوری کو سورج ۱۲ بجکر چار منٹ پر طلوع ہوتا ہے اور اکیس منٹ کے بعد ۱۲ بجکر پچیس منٹ پر غروب ہو جاتا ہے۔ اگلے دن سورج گیارہ بجکر ۴۶ منٹ پر طلوع ہوتا ہے اور ایک بجکر گیارہ منٹ پر غروب ہو جاتا ہے۔ اور ۹ مئی سے ۴ اگست تک مسلسل سورج غروب ہی نہیں ہوتا۔ گویا اگر قطبین (یعنی ۹۰ درجہ عرض البلد) پر چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے تو ۶۶ درجہ عرض البلد پر سال میں ایک دفعہ پندرہ دن تک سورج طلوع ہی نہیں ہوتا اور دوسری دفعہ پندرہ دن تک غروب نہیں ہوتا۔ یہ صورتِ حال روزہ رکھنے والوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان منطقوں میں جنہیں غیر معمولی منطقے کہا جاتا ہے، انسانوں کی اچھی خاصی تعداد بستی ہے، اور اس آبادی کا معتدبہ حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً فن لینڈ میں ایک ہزار مسلمان آباد ہیں۔ اسی طرح روس کے شمالی علاقوں میں واقع کیمپوں میں ہزاروں کی تعداد

میں مسلمان مزدور کام کرتے ہیں اور اب وہ دن بھی دُور نہیں کہ روسی مسلمان بھی آزادی کے ساتھ اپنے دین پر عمل کر سکیں گے۔ ایسے علاقوں میں نہ تو یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مسلسل چودہ دن روزہ کی حالت میں گذار دے اور نہ ہی یہ مناسب ہے کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں صرف پچیس منٹ یا دو گھنٹہ کے روزہ پر اکتفا کرے۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ امر ناگزیر ہے کہ کرۂ زمین کو اس ضرورت کے پیش نظر معمولی اور غیر معمولی دو منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ خطِ استوا سے ۴۵ درجہ شمالاً و جنوباً عرض البلد تک تو معمولی منطقہ ہو اور اس سے آگے قطبین تک دونوں جوانب غیر معمولی منطقے شمار کیے جائیں اور ان غیر معمولی منطقوں کے لیے وہی اوقاتِ سحر و افطار ہوں جو معمولی منطقے کے انتہائی اوقات سحر و افطار ہو سکتے ہیں۔

۴۵ درجہ عرض البلد کا تعین ہم اس لیے کرتے ہیں کہ پورا کرۂ ارضی خطِ استوا کے شمالاً جنوباً ۹۰ درجات عرض البلد میں منقسم ہے اور ۴۵ اس کا وسط ہے۔ اس میں کرۂ ارضی کا پورا نصف حصّہ اور خشکی کا تقریباً تین چوتھائی حصّہ آجاتا ہے اور دنیا کی کل آبادی کا تقریباً اسی فیصدی حصّہ اسی علاقے میں رہتا ہے کیونکہ برّاعظم افریقہ، عرب، ہند و پاکستان، چین، جنوب مشرقی ایشیا، ریاستہائے متحدہ امریکہ بلکہ جنوبی امریکہ تک کے تقریباً تمام علاقے اسی میں شامل ہیں۔ اس طرح ان علاقوں کے معمول میں سرے سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا جہاں اسلام کے نقوش و اثرات کافی گہرے اور قدیمی ہیں۔ اس فہرست میں جو ممالک شامل ہیں ان میں دنیائے عرب، سپین، سسلی، سمرقند، بخارا، ترکی، ایران، افغانستان، انڈونیشیا، پاکستان، ہندوستان اور البانیہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

اسے اردہ جاتے ہیں غیر معمولی منطقے جو شمال میں ۴۵ درجے سے اوپر اور جنوب میں ۴۵ درجے سے نیچے واقع ہیں، تو ہمارے بیان کردہ فارمولے کے مطابق ان کے لیے اوقاتِ سحر و افطار کا مستقل گوشوارہ یہ ہوگا۔

شمالی منطقہ		تاریخ	جنوبی منطقہ	
طلوع	غروب		طلوع	غروب
۷،۳۹	۱۶،۲۸	۱ جنوری	۴،۱۷	۱۹،۵۰
۷،۳۶	۱۶،۴۳	۱۵ "	۴،۳۱	۱۹،۴۶
۷،۲۲	۱۶،۵۶	۱ فروری	۴،۵۲	۱۹،۳۱
۷،۱۳	۱۷،۱۶	۸ "	۵،۵۵	۱۹،۲۲
۷،۵۳	۱۷،۲۶	۱۵ "	۵،۱۹	۱۹،۱۳
۶،۳۹	۱۷،۴۷	۲۲ "	۵،۲۶	۱۹،۱۵
۶،۲۶	۱۷،۵۶	یکم مارچ	۵،۳۷	۱۸،۱۴
۶،۱۴	۱۸،۵۶	۸ "	۵،۲۶	[illegible]
۶،۰۰	۱۸،۱۵	۱۵ "	[illegible]	۱۸،۴۲
۵،۴۲	۱۸،۲۷	۲۲ "	۶،۵۴	۱۸،۱۵
۵،۲۹	۱۸،۵۱	۱ اپریل	۶،۱۸	۱۸،۵۰
۵،۱۶	۱۸،۴۵	۸ "	۶،۲۹	۱۷،۵۰
۵،۵۴	۱۸،۵۴	۱۵ "	۶،۳۴	۱۷،۳۶
۴،۵۰	۱۹،۵۵	۲۲ "	۶،۴۴	۱۷،۲۶
۴،۴۰	۱۹،۱۴	۱ مئی	۶،۵۴	۱۷،۱۳
۴،۳۱	۱۹،۲۲	۸ "	۷،۵۲	۱۶،۵۹
۴،۲۳	۱۹،۲۹	۱۵ "	۷،۱۵	۱۶،۴۹
۴،۱۷	۱۹،۳۹	۲۲ "	۷،۱۸	۱۶،۴۲
۴،۱۳	۱۹،۴۴	۱ جون	۷،۲۸	۱۶،۳۵

۴٫۱۲	۱۹٫۴۸	۸ جون	۷٫۳۲	۱۶٫۲۸
۴٫۱۳	۱۹٫۵۰	۱۵ ؍	۷٫۳۷	۱۶٫۲۴
۴٫۱۷	۱۹٫۵۰	۲۲ ؍	۷٫۳۹	۱۶٫۲۴
۴٫۲۱	۱۹٫۴۸	۱ جولائی	۷٫۳۹	۱۶٫۲۵
۴٫۲۷	۱۹٫۴۴	۸ ؍	۷٫۳۷	۱۶٫۵۹
۴٫۳۴	۱۹٫۳۸	۱۵ ؍	۷٫۳۳	۱۶٫۳۳
۴٫۴۶	۱۹٫۲۷	۲۲ ؍	۷٫۲۸	۱۶٫۳۹
۴٫۵۴	۱۹٫۱۸	۱ اگست	۷٫۱۷	۱۶٫۴۵
۵٫۵۱	۱۹٫۵۷	۸ ؍	۷٫۵۸	۱۶٫۵۶
۵٫۵۹	۱۸٫۵۴	۱۵ ؍	۶٫۵۸	۱۷٫۵۳
۵٫۲۱	۱۸٫۳۸	۲۲ ؍	۶٫۴۶	۱۷٫۱۲
۵٫۳۵	۱۸٫۲۵	۱ ستمبر	۶٫۳۹	۱۷٫۲۱
۵٫۳۸	۱۸٫۱۲	۸ ؍	۶٫۱۶	۱۷٫۳۱
۵٫۴۶	۱۷٫۵۸	۱۵ ؍	۶٫۵۳	۱۷٫۴۰
۵٫۵۷	۱۷٫۴۱	۲۲ ؍	۵٫۵۴	۱۷٫۴۹
۶٫۵۶	۱۷٫۲۸	۱ اکتوبر	۵٫۳۸	۱۷٫۵۷
۶٫۱۵	۱۷٫۱۶	۸ ؍	۵٫۲۱	۱۷٫۵۷
۶٫۱۵	۱۷٫۲۸	۱۵ ؍	۵٫۵۶	۱۸٫۰۴
۶٫۲۴	۱۷٫۱۶	۲۲ ؍	۵٫۵۴	۱۸٫۳۵
۶٫۳۸	۱۶٫۴۹	۱ نومبر	۵٫۳۹	۱۸٫۴۸
۶٫۲۸	۱۶٫۳۹	۸ ؍	۵٫۳۰	۱۸٫۵۸

مطبوعات

پاکستانی معیشت پر مضامین بزبان انگریزی | از پروفیسر خورشید احمد، بی، کام، ایم اے صفحات ۲۱۵ قیمت ۵ روپے شائع کردہ مکتبہ فریدی، اردو کالج، کراچی۔

پاکستان کے معاشی مسائل کا مطالعہ دلچسپ ہونے کے علاوہ ہمارے لیے نہایت ضروری بھی ہے۔ پروفیسر خورشید صاحب نے جو ہمارے حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں، ان مسائل پر بڑی کامیابی سے قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے ہماری معیشت کے مختلف گوشوں یعنی زراعت، آبادی، ہمارے معاشی وسائل، تجارت، صنعت و حرفت اور منصوبہ بندی پر تبصرہ کتاب میں سیر حاصل

۶،۵۷	۱۶،۳۲	۱۵ نومبر	۵،۲۲	۱۹،۵۷
۷،۵۷	۱۶،۲۵	۲۲ ″	۴،۱۵	۱۹،۰۸
۷،۱۸	۱۶،۲۵	۱ دسمبر	۴،۵۸	۱۹،۲۸
۷،۲۵	۱۶،۱۸	۸ ″	۴،۵۷	۱۹،۳۷
۷،۳۱	۱۶،۱۹	۱۵ ″	۴،۵۸	۱۹،۴۳
۷،۳۶	۱۶،۲۲	۲۲ ″	۴،۱۵	۱۹،۴۷

اس گوشوارہ کو ذہن میں رکھ کر درمیانی تاریخوں کے اوقات کا حساب بآسانی لگایا جا سکتا ہے سحری کا وقت سورج طلوع ہونے سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قبل تک رہیگا۔ اسی طرح عشا کا وقت غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد شروع ہوگا۔ نصف النہار کا وقت البتہ جاڑوں میں ۱۲ بجے اور گرمیوں میں ساڑھے بارہ بجے ہوگا اور عصر کا وقت نصف النہار اور مغرب کے درمیان یعنی اندازاً ساڑھے تین بجے سے چار بجے تک شروع ہوگا۔ اس رائے سے متعدد مسلمان ممالک کے علماء اتفاق کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی (زیر ادارت اسلامک ریڈیو، لندن)

بحث کی ہے۔ اس بحث میں انہوں نے نہ صرف معاشی مسائل کے مختلف پہلوؤں کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے بلکہ قارئین کو تازہ ترین اعداد و شمار بھی فراہم کیے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب طلبہ کے مطالعہ کے پیش نظر لکھی گئی ہے اس لیے اس کا انداز کلاس نوٹس کا سا ہے۔ اور اس مقصد میں یہ بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ طلبا کے علاوہ دوسرے اہل علم حضرات بھی اس سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ طباعت کا معیار گوارا ہے۔

بہنوں کی کتاب، پہلا حصہ دوسرا اور تیسرا حصہ	تصنیف: نظر زیدی۔ قیمت پہلا حصہ ۸ ر، دوسرا ۱۵ ار اور تیسرا ۱۴ آنے شائع کردہ: ادارۂ خواتین - اچھرہ۔

بہنوں کی کتاب کے یہ تینوں حصے بچیوں کو ابتدائی تعلیم دینے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد ایک بچی اردو کی آسان اور سہل کتابیں پڑھنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ معیار کتابت و طباعت عمدہ ہے۔

(بقیہ تحریک اصلاح مذہب کا اخلاقی پس منظر)

نعان کیلین یاش جوانسکن اپنے خطبہ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ "اب عام لوگوں نے ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہر برائی اور ہر قسم کا فسق و فجور جائز ہو چکا ہے۔ اب نہ تو کوئی خدا رہا ہے، نہ ہی یوم جزا۔" لوتھر کی اصلاحی تحریک میں شامل ہونے والے زیادہ تر وہی لوگ تھے جن پر اخلاقی پابندیاں گراں گذرتی تھیں اور جو اس تاک میں تھے کہ کسی طرح انہیں پس پشت ڈالا جا سکے، چنانچہ جس وقت انہیں اس بات کا موقع ملا تو وہ فوراً اس تحریک اصلاحِ مذہب میں شامل ہو گئے۔ اس سے نہ تو اُن پر کسی الحاد اور زندقہ کا الزام لگا اور نہ ہی ان کی خواہشاتِ نفس پر کسی قسم کی پابندی عائد ہوئی ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

لوتھر نے ایک خط میں اس حقیقت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"میں دیکھتا ہوں کہ بہت سے پادری معابد اور خانقاہوں کو چھوڑ کر ہم میں محض اس لیے آشامل ہوتے ہیں کہ یہاں انہیں کام و دہن کی لذت حاصل کرنے اور سفلی جذبات کی تسکین کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔"

یہ ہے مختصر الفاظ میں لوتھر کی تحریکِ اصلاحِ مذہب کا اخلاقی پس منظر۔ اس کے مطالعہ سے آپ اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ تحریک مسیحیت کے رگ و پے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو کہاں تک دُور کرنے میں کامیاب ہوئی اور کس حد تک اس نے عیسائیت کو غیر عقلی اور غیر فطری عناصر سے پاک کر کے اسے عقلی اور فطری بنیادوں پر استوار کیا۔

اس تحریک کا مقصد مذہبی عقائد کی عقلی توجیہات فراہم کرنا نہ تھا بلکہ اس کا نصب العین اخلاق کی اُن معروضی قدروں کو نیست و نابود کرنا تھا جو مذہب کا سرمایۂ افتخار ہیں، جن کو قبول کرنے کے بعد ایک انسان کے اندر خیر و شر کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ بھلائی اور برائی میں تمیز کرنا سیکھتا ہے۔ اس تحریک کی جتنی نمایاں شخصیتیں تھیں وہ برابر اس کوشش میں منہمک رہیں کہ کسی طرح عیسائیت کے پیش کردہ اخلاق کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال دیں، اور چونکہ اس معاملہ میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی اس لیے ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس میں تبدیلی کے جذبات خالص ہوس پرستی کے راستے پر پڑ گئے اور پھر ہوس پرستی نے ہی ایک زبردست قوت بن کر حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کی صورت گری کی۔ مغرب کی موجودہ تہذیبِ الحاد درحقیقت اسی تحریکِ اصلاحِ مذہب کا شاخسانہ ہے۔ اسی کے بطن سے پھر سیکولرزم، مادی فلسفۂ حیات، حاکمیتِ جمہور اور قوم پرستی نے جنم لیا۔ پروفیسر ولیم منٹگمری اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "لوتھر سے ہٹلر تک" میں ان امور کی پوری طرح وضاحت کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ کس طرح لوتھر جو کلیسا میں اصلاح کے علمبردار کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا، ریاست کے نظام میں تبدیلی کا باعث بنا۔ وہ اگرچہ فرد کی آزادی کا ایک زبردست مبلغ اور داعی تھا لیکن اس نے

مذہبی روایات کے خلاف جو روش اختیار کی وہ بڑی خطرناک ثابت ہوئی۔ لوگوں نے جوش میں آکر اخلاق کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور پھر کوئی چیز بھی ایسی باقی نہ رہی جو انہیں کسی آئین و ضابطہ کا پابند رکھتی۔ چنانچہ انہیں پھر اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے قوم پرستی کا مسلک اختیار کرنا پڑا۔ وہ مجبور ہوئے کہ خالقِ کائنات کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کی بجائے ریاست کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور اسی کی غیر مشروط بندگی میں اپنے آپ کو دے دیں۔ ان کا جینا اور مرنا اسی کی خاطر ہو۔ مانگیں تو اسی سے مانگیں اور جھکیں تو اسی کے آگے جھکیں۔ ریاست کی ہمہ گیری اور پرستش کے تصورات سب اسی اصلاحی تحریک کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ ازلڈ لون اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"لوتھر نے اپنے کام کا آغاز ایک بین الاقوامی تحریک کے داعی کی حیثیت سے کیا لیکن اُس کے فلسفہ نے ایک ایسی ہمہ گیر ریاست کو جنم دیا جس میں افراد لامذہب آقا کے آہنی پنجوں میں جکڑے گئے۔ لوتھر عام انسانوں کی سیاسی بصیرت کے متعلق نہایت پست رائے رکھتا تھا۔ اسی لیے وہ اس بات کا قائل تھا کہ کوئی مضبوط قوت انہیں اپنی گرفت میں رکھے۔ وہ اگرچہ اس بات کا دعویدار تھا کہ خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں لیکن ریاستی امور میں اُس نے اس اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ لوتھر نے خانقاہی نظام کی اگر مخالفت کی تو اُس کی وجہ مذہبی نہ تھی بلکہ سیاسی تھی۔"

ہم نے مغرب کی اس تحریکِ اصلاحِ مذہب کے بارے میں جن حقائق کا تذکرہ کیا ہے وہ ہمارے لیے بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت اصلاحِ مذہب کے نام سے جتنی "تجدد پسند" تحریکیں چلائی جا رہی ہیں ان کے کام کرنے کا انداز بھی قریب قریب اسی تحریک کا سا ہے۔ ان تحریکات کے علمبردار بھی اسی دعوے کے ساتھ اٹھے ہیں کہ ہم اسلامی تعلیمات میں سے غیر عقلی عناصر کو چھانٹ کر الگ کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے لیے فکری بنیادیں فراہم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے تصورات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی جس چیز کو عقل اور فکر کہا جاتا ہے اُس کا خمیر بھی سبیئنت سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ حضرات بھی جارحانہ قوم پرستی کے غلط نظریات کو

عمومی مصالح کے نام پر اس ملک میں نشو و نما دینا چاہتے ہیں۔ اسلام کے اخلاقی قوانین کو توڑنے کے درپے ہیں اور اس کی درخشاں اور روشن روایات کو جنہوں نے مسلم قوم کو بنیان مرصوص بنا رکھا ہے، تار تار کر دینے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا پوری طرح علم ہے کہ اگر وہ ایک مرتبہ اس ملت کو ماضی کی روایات سے آزاد کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر انہوں نے میدان جیت لیا۔ پھر اس قوم کے جہاز بالکل بے لنگر ہو کر رہ جائیں گے اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ انہیں جس ساحل پر چاہیں گے بہلے جانے میں کامیاب ہوں گے۔ اسی لیے ان تحریکات کا سارا زور یا تو روایات کو درہم برہم کرنے میں لگا ہوا ہے، یا اُس مُلّا کی تذلیل و تضحیک پر صرف ہو رہا ہے جو ان روایات کو جوں کا توں برقرار رکھنے پر بضد ہے۔ کیونکہ وہ ان نتائج بد سے پوری طرح واقف ہے جو ان کے ٹوٹنے کے بعد کسی قوم میں بالعموم پیدا ہوتے ہیں۔

اعلان

حسبِ ذیل نئی مطبوعات چھپ کر مکتبہ میں آگئی ہیں۔ آپ اپنی فرمائش فوراً بھیجیے۔

۱۔ تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	از مولانا مودودی	۔ قیمت	۲/۱۲/-
۲۔ عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ	از مولانا اصلاحی	″	۲/۱۲/۰
۳۔ توحید و رسالت کا عقلی ثبوت	از مولانا مودودی	″	-/۱۰/-
۴۔ کلمۂ طیبہ کے معنی	″	″	-/۲/۰
۵۔ عبادت	″	″	-/۲/۰

نوٹ (۱) آخری دونوں پمفلٹ وسیع اشاعت یا مفت تقسیم کی غرض سے ایک سو یا اس سے زیادہ تعداد میں خریدنے والوں کو ۱۳/- روپے فی سینکڑہ کے حساب سے دیئے جائیں گے۔

(۲) تفسیر سورۂ نور از مولانا مودودی، مرکزی مکتبہ سے بھی مل سکتی ہے (ناظم مرکزی مکتبہ)

(بقیہ اشارات)

میں لکھتے ہیں:

والذی رأی عمر رضی اللہ عنه من الامتناع من قسمة الارضین بین من افتتحها عند ما عرفه الله ما کان فی کتابه من بیان ذالك توفیقا من الله کان له فیما صنع وفیه کانت الخیرة لجمیع المسلمین۔

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ آپ نے مجاہدین اور فاتحین کے درمیان زمین تقسیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی تائید میں قرآنِ حکیم سے دلائل پیش کیے۔ یہ سب کچھ محض اللہ کی توفیق کا نتیجہ تھا اور اللہ کی کتاب میں بصیرت حاصل ہونے کی بنا پر تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس حقیقت کو حضرت عمر کی نگاہ نے پا لیا تھا در اصل اس میں جماعتی لحاظ سے تمام مسلمانوں کی بھلائی تھی۔

بات ذرا طویل ہو گئی ہے لیکن اس کے عرض کرنے سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عمومی مصالح کے پیشِ نظر نصوص کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسی غلط فہمی جو بسا اوقات ایک انسان کو کھلی گمراہی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے بلاشبہ اجتہاد کیا لیکن ان کے کسی اجتہاد سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے کسی وقت بھی کسی نص سے صرفِ نظر کیا تھا۔ انھوں نے جو کچھ سوچا اور جو کچھ کیا وہ تعلیماتِ الٰہی کی بنیاد پر ہی تھا۔

پاکستان میں اِسلامی فکر و نظر کے علمبردار

ماہنامہ **چراغِ راہ**، کراچی

کا

"اِسلامی قانون نمبر"

مُرتّبہ: خورشید احمد، ایم اے

ماہنامہ "چراغِ راہ" کراچی جون میں اپنی ایک خاص اور اہم اشاعت "اسلامی قانون نمبر" کے نام سے شائع کر رہا ہے۔ یہ نمبر اپنے موضوع پر اردو صحافت میں ایک یگانہ و منفرد کوشش ہوگی۔ اس میں بفضلہ پہلی مرتبہ ہند و پاکستان کے ساتھ ساتھ تمام عالم اسلام کے مشاہیر علماء اور مفکرینِ اسلام کے ثمراتِ فکر و تحقیق پیش کئے جا رہے ہیں۔ اور اسلامی قانون کے ضوابط کی جدید ماحول میں ضرورت اور اُن کے طریقِ نفاذ پر خیال افروز بحث اور بصیرت اندوز رہنمائی پیش کی گئی ہے۔ نیز جدید پیرایۂ اظہار میں اسلامی ضوابطِ تعزیر اور قواعدِ حکمرانی کی تشریح اور ان میں مضمر عظیم فوائد و منافع کی حکمت کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ نمبر عصرِ حاضر کی واحد اسلامی دستوری ریاست یعنی مملکتِ پاکستان کے نئے آئین اور معاشرتی تقاضوں کے پیشِ نظر شائع کیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں اسلام پسند طبقہ کے موقف کو تقویت پہنچانے اور ذہین طبقہ کی رائے عامہ کو اسلامی قانون کے حق میں مضبوط کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ "چراغ راہ" کے اس "اسلامی قانون نمبر" کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ خود بھی چراغ راہ کی مستقل خریداری فرما کر اور اپنے حلقۂ اثر میں اس خاص نمبر کی اشاعت کو زیادہ سے زیادہ پھیلا کر ممنون فرمائیں گے۔

اس آفتابِ حقیقت کی جلوہ سامانیوں کا سرسری اندازہ لگانے کے لئے ذیل میں اس کے مندرجات کی فہرست ملاحظہ فرمائیے:

○ سوچ بچار —— جان پہچان ○

حِصّہ اوّل : قانون اور اصول قانون

○ قانون کیا ہے ؟	انصار عالم ایم اے
○ قانون اور فلسفۂ قانون	خورشید احمد، ایم اے
○ قانون کے جدید مکاتیب فکر	ڈاکٹر جارج وائٹ کراس پیٹن
○ قانون کا اشتراکی تصور	ابن نذیر، ایم اے
○ قانون اور مذہب	سر الفریڈ ڈیننگ

حِصّہ دوم: اسلام کا تصور قانون

○ فقہ اسلامی: تعریف اور قسمیں	ڈاکٹر صبحی محمصانی
○ اسلامی قانون	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
○ اسلامی قانون کی فلسفیانہ بنیادیں	ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہیدؒ
○ اسلام کا نظام قانون	ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہیدؒ
○ اسلامی قانون اور نظام معاشرت	ڈیوڈ ڈی سانتی لانا
○ اسلام کا نظامِ عدل	خلیل حامدی

حِصّہ سوم : اسلامی قانون کا تقابلی مطالعہ

○ اسلامی قانون اور انسانی قانون میں بنیادی فرق	مولانا امین احسن اصلاحی
○ اسلامی قانون اور مغربی قانون	ڈاکٹر صبحی محمصانی
○ اسلامی قانون اور بیرونی اثرات	ڈاکٹر محمد حمید اللہ
○ اسلامی قانون اور قانون روما	پروفیسر سی اے نالینو
○ کیا فقہ اسلامی قانون روما سے ماخوذ یا متاثر ہے ؟	محمود الحسن اصلاحی
○ اسلام اور جدید قانون	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

حِصّہ چہارم: ماخذ قانون اسلامی

○ اسلامی قانون کے ماخذ	ڈاکٹر مصطفیٰ زرقاء
○ عرف اور قانون اسلامی	مولانا علی محمد

- اسلامی قانون اور اس کے ماخذ — ڈاکٹر محمد حمید اللہ
- اسلامی قانون میں حدیث کا مقام — مولانا عبدالغفار حسن

حصہ پنجم: تاریخ قانون اسلامی

- اسلامی قانون کا تاریخی پس منظر — مولانا محمد تقی
- فقہ اور اصول قانون — عبدالرحمٰن ابن خلدون
- فقہ اسلامی ایک تاریخی مطالعہ — مفتی عمیم الاحسان
- اسلامی قانون کا تاریخی ارتقاء — ڈاکٹر مصطفٰے زرقاء
- تدوین قانون اسلامی اور امام ابوحنیفہؒ — ڈاکٹر محمد حمید اللہ
- فتاویٰ عالمگیری — ابصار عالم، ایم اے۔
- مجلہ احکام عدلیہ — ڈاکٹر ایس ایس اونار

حصہ ششم: دستورِ شعر

ا: منتخبات: قدیم شعراء کے کلام میں سے انتخاب

ب: نوائے تازہ: اسلام پسند شعراء کا غیر مطبوعہ کلام

حصہ ہفتم: اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید

- تدوین جدید اور اس کے تقاضے — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
- اسلامی قانون کی تدوینِ نو — مولانا امین احسن اصلاحی
- اسلامی قانون کی تشکیلِ جدید — ڈاکٹر صبحی محمصانی
- اسلامی قانون کی تشکیلِ نو — حمید اللہ صدیقی، ایم اے، ایل ایل ایم
- مطالعہ قانونِ اسلامی — ڈاکٹر اقبالؒ
- علامہ اقبال اور فقہ کی جدید تشکیل — خورشید احمد، ایم اے۔
- اجتہاد اور تقلید — ابنِ تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں — مولانا ابوالحسن علی ندوی
- مسئلہ اجتہاد — حضرت شاہ ولی اللہؒ
- اسلام میں قانون سازی اور اجتہاد — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
- اجتہاد اور قانون اسلامی — ڈاکٹر مصطفٰے زرقاء

- اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام — مولانا عبدالمجیب ندوی
- اسلامی قانون کا احیاء اور اختلافی مسائل — حضرت شاہ ولی اللہؒ
- اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل — مولانا امین احسن اصلاحی
- اسلامی قانون اور اس کے نقاد — خورشید احمد۔ ایم اے
- پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی تدابیر — مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

حصہ ہشتم بحث و نظر

سوالات: ۱۔ اسلام کا تصورِ قانون کیا ہے؟

۲۔ آپ کی نگاہ میں اسلامی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں قانون کا کیا حصہ ہے؟

اسلام اس سلسلہ میں قانون کا کیا رول متعین کرتا ہے؟

۳۔ فقہ اسلامی میں جمود کا اصل سبب کیا ہے؟

۴۔ اسلامی قانون کی تشکیل جدید کس طرح ہو سکتی ہے؟

آپ کے خیال میں:

اس کی شکل کیا ہو سکتی ہے؟

اس کے لوازمات اور تقاضے کیا ہیں؟

۵۔ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں؟

- اے۔ کے۔ بروہی ● ڈاکٹر محمد حمید اللہ ● مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
- مولانا عبدالماجد دریابادی ● مولانا ظفر احمد انصاری ● مفتی محمد شفیع
- ڈاکٹر محمد رفیع الدین ● ڈاکٹر مصطفےٰ زرقاء

اور دوسرے حضرات

حصہ نہم : ہمارا قانونی سرمایہ

- فقہی سرمایے پر ایک طائرانہ نظر ○ اسلامی قانون کی عربی کتب
- اسلامی قانون کی انگریزی کتب ○ اسلامی قانون کی اردو کتب

چراغِ راہ کراچی نمبر ۱

خــــالی صفحــــه

تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہء عمل

از

مولانا سید ابوالاعلی مودودی

یہ مولانا مودودی کی وہ تقریر ہے جو آپ نے فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع عام میں کی تھی ۔ اس میں آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ جماعت اسلامی ابتدا سے آجتک کس پالیسی پر کام کرتی رہی ہے ۔ کن کن مراحل سے گذر کر آئی ہے ۔ تقسیم ھند سے قبل حالات کیا تھے ۔ ان حالات میں جماعت کا طریق کار کیا تھا ۔ تقسیم کے بعد حالات میں کیا تغیر رونما ہوا اور اسکے تقاضے کیا تھے ۔ ایک لا دینی ریاست کو اسلامی ریاست میں بدلنے کے لئے جماعت کا فریضہ کیا تھا اور اس نے اسے کس حد تک انجام دیا ۔ پیش نظر انقلاب اور اصلاح معاشرہ کی واحد صورت کیا ہے ۔

قیمت ۰۰-۱۲-۲ روپے

تزکیہء نفس

از

مولانا امین احسن اصلاحی

* انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد کیا ہے ؟
* انسانی معاشرے کی فلاح اور انسان کی نجات اخروی کا انحصار کس چیز پر ہے ؟
* کیا ,,تزکیہ،، کا علم کوئی راز ہے ؟
* کیا ,,تزکیہ،، کا اصل موضوع انسان کی محض انفرادی زندگی ہے ؟
* علم حقیقی کا سرچشمہ کہاں ہے ؟
* معرفت الٰہی کا صحیح مفہوم اور اسکے حصول کا صحیح طریقہ کیا ہے؟
* وہ کون سے عوامل ہیں جو معرفت الٰہی کے حصول میں حجاب اور سد راہ بنتے ہیں ؟

یہ جاننے کے لئے آپ مولانا اصلاحی کی تازہ کتاب تزکیہ نفس کا مطالعہ کیجئے

قیمت ۰۰-۸-۳ روپے

ملنے کا پتہ :

* مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان ۔ اچھرہ ۔ لاہور
* سیل ڈپو مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ۔ مسلم مسجد